جلد ۷۸ جنوری ۱۹۷۳ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے خریدار اور ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کے لیے جتنا کاغذ کا کوٹہ ماہوار درکار ہوتا ہے، پرمٹ پر اُتنا نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے باقی کاغذ بازار سے گراں نرخ پر خرید کر پرچے کی مطلوبہ تعداد پوری کرنی پڑتی ہے۔

اِس لیے مجبوراً ہمیں پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔ لہٰذا ماہ دسمبر سنہ ۷۲ء سے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ اور سالانہ چندہ دس ۱۰/ روپے کر دیا گیا ہے۔

مینجر "ترجمان القرآن"

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جنوری ۱۹۷۳ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ	جلد ۷۸

اشارات	عبدالحمید صدیقی	۲
تفہیم القرآن:		
النصر (۲)	ابوالاعلیٰ مودودی	۹
اللہب	"	۱۲
مقالات:		
دعوتِ اسلامی اور کامیابی کا تصور	جناب اسعد گیلانی صاحب	۲۲
ایمان اور طمانیتِ قلب	عبدالحمید صدیقی	۳۶
مطبوعات	"	۴۵

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور

سالانہ چندہ: دس روپے —— فی پرچہ: ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح آئندہ مالی سال کے آمد و خرچ کو متوازن رکھنے کے لیے میزانیہ کی تیاری ضروری ہوتی ہے بالکل اسی طرح مستقبل کی لغزشوں سے بچنے کے لیے ماضی کا محاسبہ بھی لابدی ہے، کیونکہ اس محاسبے کے بغیر نہ تو ماضی کی کوتاہیوں کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور نہ مستقبل کی تعمیر کے لیے کوئی پائیدار بنیاد ہی فراہم ہو سکتی ہے۔ اگر حکمران جماعت اپنی گذشتہ ایک سال کی کارگزاریوں کا غیر جانبداری سے جائزہ لے اور اپنی کامرانیوں اور ناکامیوں کے گوشوارہ کو سامنے رکھ کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرے تو اس سے نہ صرف ملک اور قوم کو فائدہ پہنچے گا بلکہ عوام کے اندر اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا ملنے کے امکانات روشن ہوں گے اور اس طرح اس کا عہدِ اقتدار بھی طویل ہو سکے گا۔

برسرِ اقتدار طبقے کو خاص طور پر بھٹو صاحب کو ان کارگزاریوں کا جائزہ لیتے وقت چند باتیں اچھی طرح نگاہ میں رکھنی چاہییں۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ عوام ملک میں مارشل لا کو کسی طور پر پسند نہیں کرتے کیونکہ اس کے تلخ ثمرات کا مزہ وہ پوری طرح چکھ چکے ہیں۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ مارشل لا نے ان کی منزل کو کس طرح کھوٹا کیا ہے اور انحطاط کے کن خوفناک غاروں کی طرف اسے دھکیلا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس آئینِ زریں کے تحت ان کے جمہوری حقوق سلب ہوتے ہیں۔ ان کے اندر مختلف فتنوں کو سر اٹھانے کے مواقع ملے ہیں، اس کی شہ پاکر حکمرانوں نے عوام پر بغیر کسی خوف کے دستِ ظلم دراز کیا ہے۔ اس کے زیرِ سایہ نوکرشاہی کو اتنی غیر معمولی طاقت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اب صحیح معنوں میں بادشاہ گیر کہلانے کی مستحق ہے، اسی کا تحفظ پاکر ملک کے اندر غنڈہ گردی، اقربا پروری، چور بازاری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ پھر اس مارشل لا کی وجہ سے فوج کو ایسی ذمہ داریاں اٹھانی پڑی ہیں جو ازروئے انصاف کسی طرح بھی اس کے حصے میں نہیں آتیں اور اُسے یہ ایک ناروا

بوجھ کے طور پر خواہ مخواہ اپنی کمر پر لادنی پڑی ہیں۔ مارشل لا کی ان ساری قہرمانیوں اور ان کے عبرتناک نتائج جن میں غالباً سب سے خوفناک نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، کو دیکھتے ہوئے ملک کا کوئی بہی خواہ کبھی مارشل لا کے نفاذ کی حمایت نہیں کر سکتا۔

دوسری بات جسے بھٹو صاحب کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یہ ہے اس ملک میں کوئی ایک بھی حزب اختلاف ایسی نہیں جو طاقت سے ان سے اقتدار چھیننا چاہتی ہے۔ ساری سیاسی پارٹیاں بار بار انہیں اس امر کا یقین دلا رہی ہیں کہ وہ چونکہ ووٹوں کے ذریعے مسندِ اقتدار پر براجمان ہوئے اس لیے وہ شوق سے حکومت کریں۔ وہ ان سے بالجبر تختِ اقتدار خالی کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں، بلکہ ان سے صرف یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ ملک میں جمہوریت کے تقاضوں کو پورا کریں۔ مگر معلوم نہیں کہ بھٹو صاحب کس نفسیاتی کیفیت کے تحت اس موہوم خطرے کو حقیقت سمجھ کر یہ دہشت پھیلا رہے ہیں کہ مخالف جماعتیں مجھے مسندِ اقتدار سے محروم کرنا چاہتی ہیں اور پھر اندرونی خوف کے اس جذبہ کے زیرِ اثر مخالف جماعتوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کی وعید سناتے رہتے ہیں۔ اور انہیں یہ کہہ کر لرزہ براندام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہوں نے جب تشدد کیا تو گلی گلی اور کوچے کوچے قوم کا خون بہے گا اور یہ خون اتنا ارزاں ہوگا کہ ہمالیہ بھی اس قوم کی بدنصیبی پر خون کے آنسو بہائے گا۔

بھٹو صاحب کا یہ اندازِ فکر اور اندازِ بیان کسی نہایت خوفناک نفسیاتی اضطراب کا پتہ دیتا ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسے ٹھوس وجوہ تو موجود نہیں جن سے وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مخالف سیاسی جماعتیں انہیں زبردستی اقتدار سے ہٹانے کے درپے ہیں۔ وہ اپنے اس خدشے کی تائید کے لیے نہ تو ان جماعتوں کے کسی ذمہ دار لیڈر کا کوئی بیان پیش کر سکتے ہیں اور نہ ان جماعتوں کی کسی روش سے وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ فی الحقیقت اس مقصد کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہیں۔ صدرِ مملکت اپنے ایوانِ اقتدار میں جو زلزلہ محسوس کر رہے ہیں اس کا لاوا کسی مخالف قوت کی طرف سے تو پھوٹتا نظر نہیں آتا۔ اس زلزلے کے خطرے کا احساس یا تو ان کے ذہن میں ابھرنے والے موہوم اندیشوں کی پیداوار ہے یا اگر فی الواقع کوئی ایسا خطرہ خارج میں موجود ہے تو اس کا آتش فشاں خود ان کی ذات اور مسندِ اقتدار کے بالکل قریب جوار میں پایا جاتا ہے اس لیے صدر بھٹو صاحب کو غیروں کو دھمکیاں دینے اور انہیں عذابِ الیم کا مزہ چکھانے کے بجائے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھنا چاہیے کہ کہیں ان اندیشوں کی جڑیں ان کے لاشعور میں تو پیوست نہیں یا ان کے یمین و یسار میں جو لوگ موجود ہیں کہیں وہ تو

اپنی کرتوتوں سے ایسا وحشتناک ماحول تیار نہیں کر رہے جس میں سوائے تاریکیوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی ہو اور صدر صاحب جب اس ماحول کی ہولناکیوں سے دہشت زدہ ہو کر اس کے متعلق سوچنے لگتے ہوں تو اُن کے مصاحبین اُن کے کان میں یہ بات ڈال دیتے ہوں کہ حضور یہ مخالف سیاسی جماعتوں کا کارنامہ ہے۔

معلوم نہیں ہماری نحیف آواز صدرِ مملکت کے کانوں تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں مگر ہم صحیح صورتِ حال سے انہیں آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اِس ضمن میں ہم ان کی خدمت میں پہلی گذارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی سیاست کے ہنگاموں سے الگ ہو کر "اندرون بینی" اور خود شناسی کے لیے وقت نکالا کریں۔ کیونکہ اِس مشق کے بغیر کوئی آدمی بڑا نہیں بن سکتا۔ اگر یہ مشق نہ کی جائے تو انسان اپنی ساری کمزوریوں اور ناکامیوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور اس بنا پر وہ بلا وجہ دوسروں کو اپنا دشمن سمجھ کر اُن سے ٹکراتا رہتا ہے۔ انہیں اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ جس دشمن کو وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے مخالفوں کی صفوں میں تلاش کر رہے ہیں وہ کہیں اُن کے دل کے کسی گوشے میں چھپ کر انہیں پریشان تو نہیں کر رہا۔ اگر بھٹو صاحب اس دشمن کو ڈھونڈنے کے لیے تیار ہوں تو پھر ہم ان کے دل کے اُن گوشوں کی بھی نشان دہی کر دیتے ہیں جنہیں یہ دشمن کمین گاہ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

عام طور پر تین طرح کی نفسیاتی کیفیات موہوم خدشات کو انسان کے اندر اُبھارتی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو حال کی بعض ناکامیوں کی پیداوار ہوتی ہیں اور تیسرے وہ جن کی وجہ سے انسان کے دل کا چور خطرے کا روپ دھار کر اُس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے تو اس کی ایک توجیہ جو ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے صدرِ محترم قوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کے خود متمنی رہے ہوں اور اِس نہج پر وہ ایک طویل عرصہ تک سوچتے رہے ہوں اور انہیں نہ تو اس کا حوصلہ پڑا ہو اور نہ موزوں موقع میسّر آیا ہو اور اِس طرح اُن کی اِس دبی ہوئی اور ناکام تمنا نے اُن کے لاشعور کے کسی گوشے میں پناہ لیکر ناسُور کی صُورت اختیار کر لی ہو جو انہیں برابر پریشان کرتا رہتا ہے اور اُن کے دماغ میں یہ احساس بار بار اُبھرتا ہے کہ قوت کے بل بوتے پر اقتدار ہر وقت چھینا جا سکتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اکثر اوقات ہماری ناکام آرزوئیں اور اَدھورے عزائم لاشعور کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر خوفناک

چٹانوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن سے ہمیں ہر لحظہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ صدر بھٹو صاحب کے مزاج اور اُن کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات کوئی بعید از قیاس بھی معلوم نہیں ہوتی جس آمر کی غیر مشروط اطاعت اور فرمانبرداری میں انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا وہ وہی شخص ہے جس نے اس ملک میں طاقت کے بل بوتے پر اقتدار چھیننے کا سب سے پہلے تجربہ کیا۔ اگر بھٹو صاحب کا طرزِ فکر ان صاحب سے مختلف ہوتا اور وہ طاقت کی مدد سے تختِ اقتدار پر براجمان ہونے کو غلط سمجھتے تو وہ یقیناً اس شخص سے کبھی تعاون کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے جس نے اس ملک میں یہ غلط ریت ڈالی تھی۔ مگر بھٹو صاحب ہر معاملے میں اُن کے اس حد تک مؤید اور حامی رہے کہ بسا اوقات انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا ذوالفقار علی بھٹو نام کی کوئی الگ شخصیت بھی موجود ہے۔

ایوب صاحب کے حلقۂ ارادت سے نکلنے کے بعد انہوں نے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کے لیے جن طور طریقوں کو اپنایا انہیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ ان طریقوں سے کام لینے والا فرد سیاست کے میدان میں تشدد کا قائل نہیں اور دلائل کے زور سے بازی جیتنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بلاشبہ پاکستان کے دو صوبوں میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے میدان مار لیا مگر جس انداز سے انہوں نے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کیں اور جس دھونس اور دھاندلی کے ذریعے اُنہوں نے اپنے آپ کو آگے بڑھایا اس سے یہ بات پُوری طرح عیاں ہے کہ یہ شخص عوام کی ذہنی تربیت کر کے آگے بڑھنے کا قائل نہیں بلکہ اُن کے فکری جہاز لنگر کر کے اور طوفان اٹھا کر اُنہیں اپنے ساتھ بہائے جانا چاہتا ہے۔ جمہوری عمل اور فاشسٹ حربوں میں جو نوعی فرق پایا جاتا ہے وہ ووٹ کا استعمال اور عدمِ استعمال نہیں۔ انتخابات کا ڈھونگ تو بسا اوقات فاشسٹ ممالک میں بھی رچایا جاتا ہے مگر یہ ڈھونگ ہی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد رائے عامہ کو آگے بڑھ کر کام کرنے کا موقع فراہم کرنا نہیں ہوتا۔ جمہوریت اور فاشزم کے مابین اساسی فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں عوام کے شعور کو جلا دے کر اسے یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ قومی تعمیر و ترقی کی نہ صرف راہ متعین کرنے بلکہ عملاً اُس پر گامزن ہونے کے طور طریقے بھی بتائے۔ اس کے بعد جن لوگوں کو عوام کی قیادت اور سربراہی کے لیے منتخب کیا جائے اُن کے افکار و اعمال کا برابر محاسبہ بھی کرتا رہے۔ آپ اگر کسی ملک میں جمہوری عمل کا مطالعہ کریں تو آپ کو واضح طور پر یہ معلوم ہوگا کہ جمہوریت ایک ایسا تربیتی ادارہ ہے جس میں آزادی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ انسانوں کے شعور کی بھی باقاعدہ تربیت کی جاتی ہے اور اُسے بیدار رکھنے کا بھی پُورا التزام ہوتا ہے۔ اِس بنا پر جو جماعتیں جمہوری

عمل کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کرتی ہیں وہ پہلے مرحلے پر ارکان کی تربیت کرتی ہیں، اور انہیں سوچنے اور سمجھنے کا تعمیری انداز عطا کرتی ہیں تاکہ وہ فیصلہ کن مراحل پر ٹھیک ٹھیک قدم اٹھا سکیں لیکن اس کے برعکس جو جماعتیں فاشسٹ عزائم لے کر اٹھتی ہیں وہ عوام کے شعور کو بیدار کرنے کے بجائے اُن کے اندر ہیجانی کیفیات پیدا کرتی ہیں، تاکہ شعور معطل ہو کر رہ جائے اور وہ جذبات کے دھارے میں عوام کو جس رُخ چاہیں بہا کر لے جائیں۔ یہ جماعتیں اپنی صلاحیتیں لوگوں کی ذہنی تربیت کرنے میں نہیں کھپاتیں بلکہ عوام سے جھوٹے وعدے کرنے، انہیں مستقبل کے بارے میں سہانے خواب دکھانے، ان کے ذہنوں کو مفلوج کرنے، مخالفین کو گالیاں دینے اور انہیں بدنام کرنے اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے غنڈوں اور سماج دشمن عناصر کو اپنے ساتھ شامل کر کے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں صرف کرتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے وجود سے معاشرے میں جمہوری عمل یکسر معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور انتخابات رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ بننے کے بجائے فاشسٹ رہنماؤں کی غیر معمولی طاقت کی نمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور فاشزم کے علمبردار لیڈر جو کچھ فوج اور گولی کی قوت سے حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ وہ انتخابات اور ووٹ کے ذریعے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ صدر بھٹو نے جس انداز سے اپنی پارٹی کے کارکنوں کی تربیت کی ہے اور آج بھی وہ اِن سے جس طرح کام لے رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے کوئی عقل مند شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ صدر صاحب اس ملک میں جمہوری عمل کا فروغ چاہتے ہیں۔ ان کے طور طریقوں پر تو فاشزم کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ قوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کا جو سودا ان کے دل میں سمایا ہوا تھا اُس نے وقت کے گزرنے کے ساتھ کسی خوفناک مرض کی صورت اختیار کر لی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ بار بار اس خطرے کو مخالف جماعتوں کے جسم سے سونگھ رہے ہیں درآنحالیکہ اِس خطرے کا احساس تو ان کے اپنے دل و دماغ میں موجود ہے۔ صدر صاحب کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ذہن میں اس خطرے کی موجودگی کی دوسری وجہ ان کی ناکامیوں اور محرومیوں کا احساس بھی ہو سکتی ہے جن سے ایک سال میں انہیں دوچار ہونا پڑا ہے اور جس کا انہوں نے ۱۹ دسمبر کو دبی زبان میں جشنِ کامرانی کے انعقاد کے سلسلے میں اظہار بھی فرمایا ہے۔ الفاظ خواہ کچھ بھی ہوں مگر یہ حقیقت تو کھل کر سامنے آگئی ہے کہ وہ خود اپنی کامیابیوں پر اس طرح مطمئن نہیں جس طرح کہ اُن کے مصاحبین

ان کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ لیکن اُن کے بعض دوسرے بیانات کو اگر سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ان کے بارے میں اُن کا طرزِ فکر حقیقت پسندانہ نہیں ہوا بلکہ مختلف قسم کی خوش فہمیوں میں گرفتار نظر آتے ہیں لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قوم بھٹو صاحب کے عہدِ اقتدار میں ترقی کرنے کے بجائے ہر لحاظ سے تنزل و انحطاط کی طرف گئی ہے۔ اور ان کے سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنے کے کوئی مفید نتائج برآمد نہیں ہوسکے۔

حکمران جماعت اپنی جن اصلاحات کو سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی ہے وہ تین ہیں۔ زرعی اصلاحات، صنعتی اصلاحات اور تعلیمی اصلاحات۔ جہاں تک زرعی اصلاحات کا تعلق ہے ان سے ملک کے اندر کوئی خوش آئند تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ غریب کاشت کار ابھی ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی کے حصول کے لیے سراپا انتظار ہیں۔ حکومت نے ان اصلاحات کے ذریعے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جو چالیس لاکھ ایکڑ اراضی حاصل کی ہے۔ اس سے بے زمین کاشتکار ابھی تک محروم ہیں۔ البتہ زمیندار اور کاشت کار کے درمیان آویزش اور نفرت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے آئے دن ان کے مابین تصادم ہوتے رہتے ہیں

صنعتی اصلاحات کے تحت حکومت نے بلاشبہ بعض بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا ہے مگر اس سے نہ تو ملکی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اور نہ بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی ہی کم ہوئی ہے۔ پہلے اگر اسے مالک کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہونا پڑتا تھا تو اب بیروزگاری کا خوف ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی اضطراب نوجوں کا توں ہے مگر اس کے ساتھ صنعتی پیداوار میں تشویشناک حد تک کمی ہوگئی ہے ایک سال پہلے ہماری صنعتیں اپنی پیداواری صلاحیت کا صرف تیس فیصد حصہ بروئے کار لاتی تھیں اور آج سرکاری ماہرین اقتصادیات بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری صنعتی پیداوار مجموعی پیداواری گنجائش کا صرف ۱۸ فیصد رہ گئی ہے اس پر ہماری مالیاتی عاقبت نااندیشیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ روپے کی شرح میں غیر معمولی کمی، براہِ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں میں اضافہ، آئے دن جشن منانے پر روپے پیسے کا زیاں وزیروں اور مشیروں کی فوج ظفر موج کا قیام اور ان کی بھاری تنخواہیں اور دوسرے اخراجات اور غلط منصوبہ بندی نے عوام کو ہوشربا گرانی کے جنگل میں گرفتار کر رکھا ہے جس کی بنا پہ زندگی ان کے لیے عذاب بن گئی ہے یہی کیفیت تعلیمی اصلاحات کی بھی ہے۔ ان اصلاحات کی وجہ سے تعلیمی معیار اور مختلف اداروں کا تعلیمی ماحول جس طرح

تباہ ہوا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اپنے بچوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے یا جو تعلیم کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہوئے اسے سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔

ملک کی سیاسی زندگی ایک خوفناک ویرانے یا کسی ہولناک جنگل کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ قوم کے اندر اتحاد اور سالمیت کے احساسات اُبھرنے کے بجائے افتراق اور انتشار کے خطرناک رجحانات بڑی سُرعت کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں۔ امن و امان کی صورت نہایت ناگفتہ بہ ہے۔ مغربی پاکستان کا کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں جہاں لوگ اپنے آپ کو حکومت اور غنڈہ عناصر کی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون پاتے ہوں۔ برسرِ اقتدار طبقہ اپنے مخالفوں کو دبانے میں تمام اخلاقی اور قانونی حدود کو بڑی بیدردی سے پامال کر رہا ہے۔ جو شخص حکومت کی نظر میں اپنے سیاسی موقف کی وجہ سے ذرا معتوب ہوتا ہے، اس بیچارے پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگتا ہے۔ ایک طرف اُسے متعدد مقدمات میں اُلجھایا جاتا ہے۔ دوسری طرف حکومت کے اخبارات اس کی تذلیل شروع کر دیتے ہیں، اور تیسری طرف حکومت کی سرپرستی میں پلنے والے غنڈہ عناصر اُس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ خوف و ہراس کی اس فضا میں یا تو وہ زبان پر تالے لگا لیتا ہے یا پھر حکومت کے مظالم کا تختۂ مشق بنتا ہے۔ پنجاب میں ڈاکٹر نذیر احمد اور خواجہ رفیق کے قتل کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ ملک و ملت کے یہ غم گسار حکومت کے بعض کاموں پر حرف گیری کرنے کی جسارت کرتے تھے۔ اسی طرح آغا شورش کاشمیری، حافظ احسان الٰہی ظہیر، جناب حمزہ اور حزبِ اختلاف کے بعض دوسرے زعماء کو جن مختلف حیلوں اور بہانوں سے ستایا اور پابندِ سلاسل کیا جا رہا ہے، اس کے پیچھے اگر حکومت کی فسطائی ذہنیت کام نہیں کر رہی تو اور کونسی چیز کارفرما ہے۔ جمہوریت کی رُوح یہ ہے کہ تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے اور اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں کی بات توجہ سے سُنی جائے۔ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر آپے سے باہر ہو جانا اور ہر مخالف آواز کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے قوت کے زور سے اُسے دبانے کی کوشش کرنا جمہوریت کی راہ نہیں بلکہ فاشزم کا اندازِ حکمرانی ہے۔

پچھلے دنوں طلبہ کے معاملے میں حکومت نے جس سنگدلی اور تشدد پسندی کا مظاہرہ کیا اُسے دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ کوئی حساس انسان یہ ظالمانہ سلوک بچوں سے کر سکتا ہے؟ کیا کہ یہ بچے خود اس کے

(باقی ص ۲۶ پر)

تفہیم القرآن

النَّصر

(۲)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم والا ہے

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے[1] اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں[2] تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو،[3] اور اُس سے مغفرت کی دُعا مانگو،[4] بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ع ۱

---

[1] فتح سے مراد کسی ایک معرکے میں فتح نہیں، بلکہ وہ فیصلہ کُن فتح ہے جس کے بعد ملک میں کوئی طاقت اسلام سے ٹکر لینے کے قابل باقی نہ رہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عرب میں اسی دین کو غالب ہو کر رہنا ہے۔ بعض مفسّرین نے اس سے مُراد فتحِ مکّہ لی ہے۔ لیکن فتح مکہ ۸ھ میں ہوئی ہے اور اِس سُورہ کا نزول ۱۰ھ کے آخر میں ہُوا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت سرّاءؓ بنتِ نبہان کی اُن روایات سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے دیباچے میں نقل کی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول بھی اِس تفسیر کے خلاف پڑتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی سب سے آخری سُورۃ ہے۔ کیونکہ اگر فتح سے مراد فتح مکّہ ہو تو پُوری سُورۂ توبہ اس کے بعد نازل ہوئی تھی، پھر یہ سورۃ آخری سُورۃ کیسے ہو سکتی ہے۔ بلا شبہ فتح مکّہ اس لحاظ سے فیصلہ کُن تھی کہ اُس نے مشرکینِ عرب کی ہمتیں پست کر دی تھیں، مگر اُس کے بعد بھی اُن میں کافی دَم خَم باقی تھا۔ طائف اور حُنَین کے معرکے اس کے بعد ہی پیش آئے اور عرب پر اسلام کا غلبہ مکمل ہونے میں تقریباً دو سال صرف ہوئے۔

[2] یعنی وہ زمانہ رخصت ہو جائے جب ایک ایک دو دو کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے، اور وہ وقت آجائے جب پُورے پُورے قبیلے، اور بڑے بڑے علاقوں کے باشندے کسی جنگ اور مزاحمت کے بغیر از خود

مسلمان ہونے لگیں۔ یہ کیفیت سنہ ۹ھ کے آغاز سے رونما ہونی شروع ہوئی جس کی وجہ سے اُس سال کو سالِ وفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اسلام قبول کر کے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۰ھ میں جب حضور حجۃ الوداع کے لیئے تشریف لے گئے اُس وقت پُورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا اور ملک میں کوئی مشرک باقی نہ رہا تھا۔

۳؎ حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرنا بھی ہے اور اُس کا شکر ادا کرنا بھی۔ اور تسبیح سے مُراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منزّہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اِس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اِس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی اِس خیال کا کوئی شائبہ تک نہ آنے پائے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے، بلکہ اِس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو، اِس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب و زبان سے اِس امر کا اعتراف کرو کہ اِس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اِس سے پاک اور منزّہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمہاری کسی سعی و کوشش کا محتاج یا اُس پر منحصر تھا۔ اِس کے برعکس تمہارا دل اِس یقین سے لبریز رہے کہ تمہاری سعی و کوشش کی کامیابی اللہ کی تائید و نصرت پر منحصر تھی، وہ اپنے جس بندے سے چاہتا اپنا کام لے سکتا تھا اور یہ اُس کا احسان ہے کہ اس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمہارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کرایا۔ اِس کے علاوہ تسبیح، یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی محیر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے، اور اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اُس سے صادر ہو سکتا۔

۴؎ یعنی اپنے رب سے دُعا مانگو کہ جو خدمت اُس نے تمہارے سپُرد کی تھی اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو، اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دی ہوں، اور اِس کی عبادت و بندگی بجالانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اُس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پُورا کا پُورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اُسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا، اور اُسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اُس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو اس سے درگزر فرما کر میری حقیر سی خدمت قبول

فرمائے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اس غرّے میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اُس پر تھا وہ اُس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اِس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کوئی مخلوق اُسے ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمتِ دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان راہِ خدا میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔" اسی طرح جب کبھی انہیں کوئی فتح نصیب ہو، اُسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔

تصحیح

المؤمنون

تفہیم القرآن، جلد سوم، آیت ۱۱۱ میں اِنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ہے۔

تفہیم القرآن

اللّھب

نام | پہلی آیت کے لفظ لَہَب کو اِس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اِس کے مکی ہونے میں تو مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ٹھیک ٹھیک یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ مکی دَور کے کس زمانے میں یہ نازل ہوئی تھی۔ البتہ ابولہب کا جو کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ حق کے خلاف تھا اُس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس سُورہ کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہوگا جب وہ حضورؐ کی عداوت میں حد سے گزر گیا تھا اور اُس کا رویّہ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن رہا تھا۔ بعید نہیں کہ اِس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان والوں کا مقاطعہ کر کے قریش کے لوگوں نے اُن کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور تنہا ابولہب ہی ایسا شخص تھا جس نے اپنے خاندان والوں کو چھوڑ کر دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ ابولہب حضورؐ کا چچا تھا، اور بھتیجے کی زبان سے چچا کی کھلم کھلا مذمّت کرانا اُس وقت تک مناسب نہ ہو سکتا تھا جب تک چچا کی حد سے گزری ہوئی زیادتیاں علانیہ سب کے سامنے نہ آ گئی ہوں۔ اِس سے پہلے اگر ابتدا ہی میں یہ سُورۃ نازل کر دی گئی ہوتی تو لوگ اس کو اخلاقی حیثیت سے معیوب سمجھتے کہ بھتیجا اپنے چچا کی اِس طرح مذمّت کرے۔

پس منظر | قرآنِ مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اُس کی مذمّت کی گئی ہے، حالانکہ مکّے میں بھی، اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اِس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمّت کی گئی ہے؟ اِس بات کو

سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے، اور اُس میں ابُولہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پُورے ملکِ عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطع رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضورؐ کی شدید مخالفت کی، مگر بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب (ہاشم کے بھائی مُطّلِب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ کھلم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ آپ کی نبوّت پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے ان خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دینِ آبائی سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اِس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشتیبانی کرنا قریش اور اہلِ عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اِس اخلاقی اصول کو، جسے زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا۔ اور وہ تھا ابولہب بن عبد المُطّلِب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ حضورؐ کے والدِ ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خصوصاً جبکہ بھتیجے کا باپ مر چکا ہو تو توقع کی جاتی تھی کہ چچا بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا۔ لیکن اِس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں ان تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

ابنِ عباسؓ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی

ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت)۔ عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضورؐ کی یہ آواز سُن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے۔ اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آسکتا تھا اُس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا، اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمُطّلِب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔ اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟ "ستیاناس جائے تیرا، کیا اس لیے تُو نے ہمیں جمع کیا تھا؟" ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اُٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے (مُسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)۔

ابن زید کی روایت ہے کہ ابُولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا اگر میں تمہارے دین کو مان لُوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جو دوسرے ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا تَبًّا لِھٰذَا الدِّیْنِ تَبًّا اَنْ اَکُوْنَ وَھٰؤُلَآءِ سَوَآءً "ستیاناس جائے اس دین کا جس میں مَیں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں" (ابن جریر)۔

مکّہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اُس کے علاوہ حَکَم بن عاص (مروان کا باپ)، عُقبَہ بن ابی مُعَیط، عَدِی بن حَمراء اور ابن الاَصداء الھُذَلِی بھی آپ کے ہمسائے تھے۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اُوپر سے بکری کا اوجھ آپ پر پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا

تو یہ منڈیا پر غلاظت پھینک دیتے ۔حضورؐ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبد مناف، یہ کیسی ہمسایگی ہے؟" ۔ ابولہب کی بیوی اُمّ جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لاکر ڈال دیتی تاکہ صبح سویرے جب آپ یا آپ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے (بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن عساکر، ابن ہشام)۔

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عُتیبہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضورؐ کے سامنے آکر اُس نے کہا کہ میں اَلنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی اور اَلَّذِیْ دَنَا فَتَدَلّٰی کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اُس نے حضور کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا خدایا، اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کُتّے کو مسلط کر دے۔ اس کے بعد عُتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ دورانِ سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بد دعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عُتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اُس نے عُتیبہ کو پھاڑ کھایا۔ (الاستیعاب لابن عبد البر، الاصابہ لابن حجر، دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانی، روض الانف للسُّہیلی۔ روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلانِ نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عُتبہ تھا یا عُتیبہ۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتح مکہ کے بعد عُتبہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عتیبہ تھا)۔

اُس کے خبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں

شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور اُن کو خبر دی کہ لو آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام و نشان ہو گئے۔ اُس کی اس حرکت کا ذکر ہم سورۂ کوثر کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا۔ ربیعہؓ بن عبّاد الدِّیلی بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے "لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے" اور آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ "یہ جھوٹا ہے، دین آبائی سے پھر گیا ہے"۔ میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مُسند احمد، بیہقی)۔ دوسری روایت انہی حضرت ربیعہ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں "اے بنی فلاں، میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے"۔ آپ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "اے بنی فلاں، یہ تم کو لات اور عزّیٰ سے پھیر کر اُس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو"۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے۔ انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مُسند احمد۔ طبرانی)۔ طارقؓ بن عبداللہ المحاربی کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ "لوگو، لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے"۔ اور پیچھے ایک شخص ہے جو آپ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ "یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو"۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (ترمذی)۔

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے

ہوئے شعبِ ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفارِ قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اِس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقوں کی نوبت آگئی۔ مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعبِ ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ اِن سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ بھی ہو گا اُسے میں پورا کروں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا پھر ابولہب انہی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاؤ خرید لیتا (ابن سعد و ابن ہشام)۔

یہ اس شخص کی حرکات تھیں جن کی بنا پر اس سورہ میں نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ خاص طور پر اس کی ضرورت اِس لیے تھی کہ مکہ سے باہر کے اہلِ عرب جو حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے، اُن کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا چچا آپ کے پیچھے لگ کر آپ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلافِ توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلاوجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بھتیجے کو برا بھلا کہے اور اُسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اِس وجہ سے وہ ابولہب کی بات سے متأثر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے تھے۔ مگر جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور ابولہب نے غصے میں بھر کر اَول فَول بکنا شروع کر دیا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اِس شخص کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے، کیونکہ یہ اپنے بھتیجے کی دشمنی میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

اِس کے علاوہ نام لے کر جب آپؐ کے چچا کی مذمت کی گئی تو لوگوں کی یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کسی کا لحاظ کر کے کوئی مداہنت برت سکتے ہیں۔ جب علی الاعلان رسول کے اپنے چچا کی خبر لے ڈالی گئی تو لوگ سمجھ گئے کہ یہاں کسی لاگ لپیٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ غیر اپنا ہو سکتا ہے اگر ایمان لے آئے، اور اپنا غیر ہو جاتا ہے اگر کفر کرے۔ اِس معاملہ میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

ٹوٹ گئے ابُولہب کے ہاتھ اور نامُراد ہو گیا وُہ[1]۔ اُس کا مال اور جو کچھ اُس نے کمایا وہ اُس کے کسی کام نہ آیا[2]۔ ضرور وُہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اُس کے ساتھ) اُس کی جورُو بھی[3]، لگائی بجھائی کرنے والی[4]، اُس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی[5] ع

---

[1] اِس شخص کا اصل نام عبدالعزّیٰ تھا، اور اسے ابُولہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سُرخ وسفید تھا۔ لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اور ابُولہب کے معنی ہیں شعلہ رو۔ یہاں اُس کا ذکر اُس کے نام کے بجائے اُس کی کُنیت سے کرنے کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زیادہ تر اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی کُنیت ہی سے معروف تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کا نام عبدالعزّیٰ (بندۂ عُزّیٰ) ایک مشرکانہ نام تھا اور قرآن میں یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اُسے اِس نام سے یاد کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اُس کا جو انجام اِس سُورہ میں بیان کیا گیا ہے اُس کے ساتھ اُس کی یہ کُنیت ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ کے معنی بعض مفسّرین نے "ٹوٹ جائیں ابولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں اور وَتَبَّ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہو جائے" یا "وہ ہلاک ہو گیا"۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اُس کو دیا گیا ہو، بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آئندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، گویا اُس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکا۔ اور فی الواقع آخر کار وہی کچھ ہُوا جو اِس سُورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مُراد ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اُس نے اپنا پُورا زور لگا دیا ہو۔ اور ابولہب نے واقعی حضورؐ کو زک دینے میں اپنا پُورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اِس سُورہ کے نزول پر سات آٹھ ہی سال گزرے تھے کہ جنگِ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکّہ میں جب اِس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہُوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ پھر اس کی موت بھی نہایت عبرتناک تھی۔ اُسے عَدَسَہ نامی بیماری ہو گئی جو طاعون سے مِلتی جُلتی ہوتی ہے۔ اُس کے گھر والوں نے اُسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں چھوت لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین دن تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بو پھیلنے لگی۔ آخر کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور اُنہی مزدوروں نے

اس کو دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اُوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اُسے ڈھانک دیا۔ اُس کی مزید اور مکمل شکست اِس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اُسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرّہ ہجرت کر کے مکّہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکّہ کے موقع پر اُس کے دونوں بیٹے عُتبہ اور مُعَتِّب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوتے اور ایمان لا کر انہوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

؎۲ ابولہب سخت بخیل اور زر پرست آدمی تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک مرتبہ اُس پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ اس نے کعبہ کے خزانے میں سے سونے کے دو ہرن چُرا لیے ہیں۔ اگرچہ بعد میں وہ ہرن ایک اور شخص کے پاس سے برآمد ہوئے، لیکن بجائے خود یہ بات کہ اس پر یہ الزام لگایا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ مکّہ کے لوگ اُس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اُس کی مالداری کے متعلق قاضی رشید بن زبیر اپنی کتاب اَلذَّخَائِرُ وَالتُّحَف میں لکھتے ہیں کہ وہ قریش کے اُن چار آدمیوں میں سے ایک تھا جو ایک ایک قِنطار سونے کے مالک تھے (قنطار دو سو اَوقیہ کا اور ایک اَوقیہ سوا تین تولہ کا ہوتا ہے)۔ اُس کی زر پرستی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر، جبکہ اُس کے مذہب کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، قریش کے تمام سردار لڑنے کے لیے گئے، مگر اُس نے عاص بن ہشام کو اپنی طرف سے لڑنے کے لیے بھیج دیا اور کہا کہ یہ اُس چار ہزار درہم قرض کا بدل ہے جو میرا تم پر آتا ہے۔ اس طرح اُس نے اپنا قرض وصول کرنے کی بھی ایک ترکیب نکال لی، کیونکہ عاص دیوالیہ ہو چکا تھا اور اُس سے رقم ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

مَا کَسَبَ کو بعض مفسّرین نے کمائی کے معنی میں لیا ہے، یعنی اپنے مال سے جو منافع اُس نے حاصل کیے وہ اُس کا کسب تھے۔ اور بعض دوسرے مفسّرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کا بیٹا بھی اُس کا کسب ہے (ابوداؤد۔ ابن ابی حاتم)۔ یہ دونوں معنی ابولہب کے انجام سے مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ عَدَسہ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس کا مال بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور اس کی اولاد نے بھی اسے بے کسی کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس کا جنازہ تک عزت کے ساتھ اٹھانے کی اس اولاد کو توفیق نہ ہوئی۔ اس طرح چند ہی سال کے اندر لوگوں نے اُس پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا جو ابولہب کے متعلق اس سورہ میں کی گئی تھی۔

؎۳ اس عورت کا نام اَروٰی تھا اور اُمِّ جمیل اِس کی کُنیت تھی۔ یہ ابوسفیان کی بہن تھی اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ عداوت میں اپنے شوہر ابو لہب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی اور ام جمیل نے اس کو سنا تو وہ بپھری ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھی بھر پتھر تھے اور وہ حضورؐ کی ہجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ، یہ آ رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپ کو نہیں دیکھ سکی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سنا ہے تمہارے صاحب نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، اِس گھر کے رب کی قسم اُنہوں نے تو تمہاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی (ابن ابی حاتم۔ سیرۃ ابن ہشام۔ بزار نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اسی سے ملتا جلتا واقعہ نقل کیا ہے)۔ حضرت ابوبکرؓ کے اِس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔

ؔ اصل الفاظ ہیں حَمَّالَةَ الْحَطَبِ جن کا لفظی ترجمہ ہے "لکڑیاں ڈھونے والی"۔ مفسرین نے اس کے متعدد معنی بیان کیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابن زید، ضحاک اور ربیع بن انس کہتے ہیں کہ وہ راتوں کو خاردار درختوں کی ٹہنیاں لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈال دیتی تھی، اس لیے اس کو لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا ہے۔ قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، مجاہد اور سُفیان ثوری کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں فساد ڈلوانے کے لیے چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔ اس لیے اسے عربی محاورے کے مطابق لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا، کیونکہ عرب ایسے شخص کو جو ادھر کی بات اُدھر لگا کر فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا ہو، لکڑیاں ڈھونے والا کہتے ہیں۔ اِس محاورے کے لحاظ سے حمالۃ الحطب کے معنی ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں "بی جمالو" کے معنی ہیں۔ سعید بن جُبیر کہتے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد رہا ہو اُس کے متعلق عربی زبان میں بطورِ محاورہ کہا جاتا ہے فلانٌ یحتطب علی ظہرہٖ (فلاں شخص اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لاد رہا ہے)۔ پس حمالۃ الحطب کے معنی ہیں گناہوں کا بوجھ ڈھونے والی۔ ایک اور مطلب مفسرین نے اس کا یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ آخرت میں اُس کا حال ہو گا، یعنی وہ لکڑیاں لا لا کر اُس آگ میں ڈالے گی جس میں ابولہب جل رہا ہو گا۔

ؔ اُس کی گردن کے لیے جِید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسی گردن کے لیے بولا جاتا ہے جس میں زیور پہنا گیا ہو۔ سعید بن المُسَیَّب، حسن بصری اور قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت قیمتی ہار گردن میں پہنتی تھی، اور کہا کرتی تھی کہ لات اور عُزّیٰ کی قسم میں اپنا یہ ہار بیچ کر اس کی قیمت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عداوت میں خرچ کر دوں گی۔

اِسی بنا پر جید کا لفظ یہاں بطورِ طنز استعمال کیا گیا ہے کہ اِس مزین گلے میں، جس کے ہار پر وہ فخر کرتی ہے، دوزخ میں رسّی پڑی ہوگی۔ یہ اسی طرح کا طنزیہ اندازِ کلام ہے جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے۔ بَشِّرْهُم بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ، اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

جو رسّی اس کی گردن میں ڈالی جائے گی اس کے لیے حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یعنی وہ رسّی مَسَد کی قسم سے ہوگی۔ اِس کے مختلف معنی اہلِ لغت اور مفسّرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ خوب مضبوط بٹی ہوئی رسی کو مسد کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رسّی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ تیسرا قول ہے کہ اس کے معنی ہیں، مونجھ کی رسّی یا اونٹ کی کھال یا اس کے صوف سے بنی ہوئی رسّی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد لوہے کے تاروں سے بٹی ہوئی رسّی ہے۔

دعوتِ اسلامی اور کامیابی کا تصوّر

جناب اسعد گیلانی صاحب

ہر کام کے آغاز کے ساتھ ہی اس کے کامیاب انجام کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کر کے کام کیا جا سکے۔ کام کا بہتر آغاز کرنے والا اس کے خوشتر انجام کی توقع بہر حال رکھتا ہے اور تعاون کرنے والا دل سے یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کے تعاون کا نتیجہ کامیابی کی خوشخبری کی صورت میں اس کے سامنے ظاہر ہو۔

کامیابی کے مختلف تصوّرات لیکن دعوتِ اسلامی کا میدان کامیابی کے صرف ایک ہی مروجہ مفہوم کا پابند نہیں ہے کہ جو کچھ چاہا جاتے اسے اِس دنیا میں مادّی طور پر حاصل کر لیا جائے۔ اِس میدان میں کامیابی کے اُس سے مختلف مفہوم بھی مروّج ہیں۔

اللہ کی تشریعی حاکمیت کے مفہوم و مدعا سے بے خبر، اس کے نفاذ و اجراء سے بے پروا، اور خدائی احکام سے بے نیاز، بگڑے ہوئے فتنہ پرداز انسانی معاشرے میں دعوتِ اسلامی کا آغاز ایک انقلابی دعوت کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ دعوت پیش کرنے والا بالعموم ایک ہی قوم کے تناسُب سے اِس دعوت کا آغاز کرتا ہے اور تدریج و ترتیب سے ہی اس کے ساتھیوں اور رفیقوں میں کم و بیش اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے یہ ساتھی بھی بنیادی طور پر اسی انقلابی دعوت کے مبلّغ ہوتے ہیں اور اس تبلیغ کے نتیجے میں معاشرے میں سے اپنے ہم خیال افراد کو چھانٹ چھانٹ کر اپنے ساتھ ملاتے رہتے ہیں۔ اس معاشرے میں دعوتِ اسلامی کے اوّلین داعی اور پھر اس کے ساتھیوں کا اپنے سارے ممکن ذرائع و وسائل کے ساتھ عوام تک اپنی بات پہنچانے اور سمجھانے کی تمام تدابیر اختیار کرنا اور پھر عمر بھر اپنے مؤقف کو احسن سے احسن طریقے پر ان کے سامنے پیش کرتے رہنا اور بد سے بدتر حوصلہ شکن حالات میں بھی ہمت نہ ہارنا، اور حق بات کہتے، پھیلاتے اور پہنچاتے رہنا بجائے خود بہت بڑی کامیابی ہے، چاہے اس کے ظاہری نتائج چند افراد کی اصلاح تک ہی محدود ہوں، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے چند حواریوں کے درمیان ہی دعوت محصور ہو کر رہ گئی تھی۔

یُوں دعوت کو پُوری مستقل مزاجی سے پیش کرتے رہنا بھی بجائے خود بہت بڑی کامیابی ہے۔

اجتماعی تبدیلیوں کا انحصار مشیّتِ الٰہی کے اُن فیصلوں پر مبنی ہوتا ہے جو قوموں میں بناؤ اور بگاڑ کے متعین اصولوں کے مطابق نافذ ہوتے ہیں اور جن کا منشا انسانی معاشرے کو قابلِ برداشت حالات میں قیامت تک کی ایک مدت معیّنہ تک زمین پر آباد رکھنا ہے۔ ایسے حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہر تحریک چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، معاشرے کے پُرامن وجود کو برقرار رکھنے اور انسانی آبادیوں کو قابلِ رہائش رکھنے کی پابندی کے تحت ہی عملاً نتیجہ خیز یا بے نتیجہ ہوتی ہے۔

البتہ دعوتِ اسلامی کی تحریک چونکہ انسانی زندگی کے لیے دین و دنیا دونوں پر محیط ہوتی ہے اور اس کا وجود دنیا سے آخرت تک کے نتائج سے بحث کرتا ہے اس لیے اس کا تصورِ کامیابی وسیع تر مفہوم کا حامل ہوتا ہے "دنیا میں نظامِ اسلامی کا قیام اور اللہ کے دین کا غلبہ اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصُول" ـــــ اِس طرح دعوتِ اسلامی کے ایک کام کے نتیجے میں عملاً دو کامیابیاں اس کے پیشِ نظر ہوتی ہیں۔ دنیوی اور مادی کامیابی کا تعلق غلبہ اسلام سے ہوتا ہے جو دنیا کے مادی اسباب کے تحت ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک رضائے الٰہی کے حصُول کا تعلق ہے وہ کسی مادی کامیابی کے حصُول سے مشروط نہیں ہے۔ وہ تو بندے کے اخلاصِ عمل اور وفاداری بشرطِ استواری کی قدر افزائی پر مبنی ہے۔ اِس لیے دنیا کی سیاسی تحریک کی ناکامی مومن کو رضائے الٰہی کے حصول کی کامیابی سے نہیں روک سکتی۔ بلکہ بعض حالات میں تو اس کے حصول میں مددگار و معاون بن جاتی ہے۔

مومن کی زندگی میں کامیابی کا یہ اُخروی تصور عمل کے دائرے میں بہت وسیع اثرات رکھتا ہے۔ اقامتِ دین کا کام بجائے خود ایک فریضہ اور عبادتِ الٰہی ہے۔ مومن عمر بھر فریضۂ نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے لیے دنیا میں زندگی بھر کسی بدلے کی کوئی امید اور آرزو نہیں رکھتا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کرتا اور حج کا پُر صعوبت سفر اختیار کر کے نہایت محنت سے کمایا ہُوا مال صرف کرتا ہے۔ لیکن اس مال اور مشقت کے بدلے میں بھی اِس دنیا میں کسی بدلے کی طلب نہیں رکھتا، بلکہ جو کچھ چاہتا ہے اللہ سے چاہتا ہے اور اس کے پاس جا کر آخرت میں ہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح فریضۂ اقامتِ دین بھی ایک عبادت ہے جسے ہمیشہ انبیاء اور صالحین ادا کرتے رہے ہیں اور مومن اِس جدوجہد اور عبادت کا اجر بھی خدا سے ہی چاہتا ہے اور آخرت میں ہی چاہتا ہے۔ شاید یہی وہ تاثر تھا جس کے تحت حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا تھا کہ "ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو ہمارا عمل واضح اور اللہ سے امیدیں بہت تھیں۔ اے کاش کہ ہم اُس دَور میں ہی اِس دنیا سے اُٹھ گئے ہوتے بعد

کی کامیابیوں نے تو معاملہ مخدوش کر دیا ہے۔"

دنیا میں صالحین کے ذریعے نظامِ اسلامی کے غلبے والی کامیابی اللہ کے نزدیک اتنی بے حقیقت اور ناقابلِ التفات ہے کہ اس نے اپنے قرآن میں اپنے ہی بھیجے ہوئے جن انبیاء کا تذکرہ کیا ہے ان میں کثیر تعداد صرف اُن اولوالعزم انبیاءِ کرام کی ہے جو عمر بھر اپنا فریضۂ دعوتِ اسلامی ادا کرتے رہے لیکن دنیوی غلبے سے محرومی کی حالت میں ہی اپنے مالک کے پاس چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کا اپنے قرآن میں جابجا متعدد بار بے تکلف تذکرہ فرمایا ہے، اور اس بات کی قطعی پروا نہیں کی کہ بعد میں آنے والے مومنین دعوتِ اسلامی کی دنیوی مادی ناکامی کی اتنی کثیر مثالوں سے بد دل ہو جائیں گے۔ بلکہ ان مثالوں کو اپنے مخلص وفادار اور محسن بندوں کے انتخاب و تربیت کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور ان کے سامنے یہ حقیقت واضح کر کے رکھ دی ہے کہ حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور بندۂ مومن کو اپنا سارا زور آخرت کی زندگی اور اس کی بہتری اور اُخروی انعامات کے حصول کی سعی پر ہی صرف کرنا چاہیے۔

حضورؐ نے فرمایا "دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی ایک انگلی دریا میں ڈال کر نکال لے پھر دیکھے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔" (صحیح مسلم)

دوسرے موقعہ پر آخرت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضورؐ نے سمندر میں سے چڑیا کے چونچ بھر پانی کو آخرت اور دنیا کی نسبت کے طور پر بیان فرمایا اور اُخروی انعام کا ذکر اس طرح فرمایا کہ:

"جنت میں ایک کوڑا رکھنے کی جگہ دنیا اور دنیا کے سرو سامان سے بہتر ہے" (بخاری)

اس سلسلے میں ایک تمثیل بھی حضورؐ نے پیش فرمائی:۔

"فرمایا: دنیا کے سب سے خوش حال آدمی کو لایا جائے گا اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا پھر جب آگ اس کے جسم پر اپنا پورا اثر دکھائے گی تب اس سے پوچھا جائے گا کہ کبھی تُو نے اچھی حالت بھی دیکھی ہے؟ تجھ پر کبھی عیش و آرام کا زمانہ بھی آیا ہے؟ وہ کہے گا نہیں، تیری قسم اے میرے رب، کبھی نہیں۔ پھر دنیا میں انتہائی تنگی کی حالت میں زندگی گزارنے والے شخص کو لایا جائے گا۔ جب اس پر جنت کی نعمتوں کا رنگ خوب چڑھ جائے گا تب اس سے پوچھا جائے گا کہ تُو نے کبھی تنگی بھی دیکھی ہے؟ کبھی تجھ پر تکلیف کا دور بھی گزرا ہے؟ وہ کہے گا اے میرے رب، میں کبھی تنگ دستی اور محتاجی میں گرفتار نہیں ہوا۔ میں نے تکلیف کا کوئی دور کبھی نہیں دیکھا۔" (صحیح مسلم)

حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی دعوت کی دنیوی کامیابی کے بے شمار اسباب میں ایک یہ راز بھی مضمر ہے کہ حضوؐر قیامت تک کے لیے آخری نبی ہیں۔ حضوؐر کا لایا ہوا دین قابلِ عمل اور قابلِ اتباع ہے اور ہر دور میں اس کے غلبے کے لیے عام معمول کے مطابق عملی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ اس طرح یہ دنیوی فلاح اور اُخروی نجات کا وہ بہترین عملی نسخہ ہے جس پر عمل کر کے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور مومنین پر لازم ہے کہ وہ اس کام کے لیے عملی جدوجہد کریں اور حسبِ استعداد اور حسبِ توفیق کامیابیاں حاصل کریں۔ اس لیے کہ صرف یہی ایک ایسا کام ہے جس میں اوّلین اقدام کے ساتھ ہی کامیابی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چند افراد تک دعوت پہنچا کر دنیا سے رخصت ہو گئے تو بھی کامیابی ہے۔ کامیابی خارجی مظاہر سے زیادہ اُخروی نتائج کے ساتھ وابستہ ہے اور اس راہ پر چلنے والا کوئی ایک شخص بھی اُخروی کامیابی کو چھوڑ کر صرف دنیوی کامیابی کے حصول پر راضی نہیں ہو سکتا۔ دعوتِ اسلامی کے علم برداروں میں سے ہر شخص کے سامنے اگر دونوں میں سے ایک ہی کامیابی رکھ دی جائے تو ان میں سے کوئی نہ ملے گا جو اُخروی کامیابی پر دنیا کی بادشاہت کو ترجیح دے سکے۔ یہی اُسوہ انبیاؑ ہے اور دعوتِ اسلامی کے سب علم بردار ہر دور میں پورے شرح صدر کے ساتھ اسی اُسوہ کے پیروکار ہوتے ہیں۔

ہر فرد کی کامیابی اس کے اپنے فریضے کی ادائیگی کے معیار کے مطابق جانچی جاتی ہے نہ کہ کسی دوسرے کی کارکردگی کی نسبت سے۔ دعوتِ دین کے علم بردار اور دعوتِ اسلامی کے مُبلّغ کا پہلا فریضہ حق بات کو دوسروں تک احسن طریقے کے ساتھ پہنچا دینا ہے اور اسی کام کے نقطۂ نظر سے وہ جانچا جائے گا کہ کیا اس نے اپنی رسائی کی حد کے اندر قوم کے فرد فرد تک دعوت پہنچائی؟ احسن طریقے پر پہنچائی؟ تمام مشکلات کو صبر کے ساتھ برداشت کر کے اور تمام مخالفتوں کے باوجود پہنچائی؟ اور اس راستے کی تمام مزاحمتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا؟ اگر اس نے یہ کام اپنے ضمیر کی طمانیت، اپنے رفقاء کے اعتماد و اعتراف اور اپنے دعوتی نظم کے اطمینان کی حد تک کر لیا تو وہ اپنے فرض کی انجام دہی میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں تک اس دعوت کو قبول کرنے یا رد کر دینے، اور قبول کرنے کی صورت میں موافقت، یا رد کر دینے کی صورت میں مخالفت کا تعلق ہے یہ داعی کا نہیں مخاطب کا دائرۂ کار ہے، اور ظاہر ہے کہ جس مقام سے خدا کے سامنے جواب دہی کا وہ دائرہ شروع ہوتا ہے جس کا تعلق دعوتِ دین کے کارکن سے نہیں ہے، اس کی کوئی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔ دعوت کو قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کا ثواب و عذاب داعیِ حق کا نہیں بلکہ مخاطب قوم کا خود اپنا حصہ ہے۔ اگر داعیِ حق کے مخاطب کچھ لوگ دعوت سُن کر اسے اعترافِ حق کی حد تک قبول کرتے ہیں یا اس سے آگے بڑھ کر رفاقت کرنے

اور اس راستے میں ایثار و قربانی بھی کرتے ہیں تو یہ ان لوگوں کی اپنی کامیابی ہے۔ اور اگر دعوتِ دین سے مُنہ موڑ کر جہنم کے گڑھے اور غضبِ الٰہی کا رُخ کرتے ہیں تو یہ بھی ان کی اپنی تباہی اور ناکامی ہے۔ داعیٔ حق اپنا فریضہ ادا کر دینے کے بعد دونوں صورتوں میں کامیاب ہے۔

غلبۂ اسلام بھی مطلوب ہے کامیابی اور ناکامی کی ان اخلاقی تعبیرات کے باوجود دعوتِ دین کی یہ کامیابی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام و فرامین اللہ کے بندوں پر بالفعل نافذ ہوں ایسی دلفریب، دل خوش کُن اور خوشگوار صورتِ حال ہے جسے مکمل کامیابی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور ایک بندۂ حق جو ہر حال میں راضی برضا رہنے کا ہی عادی ہے اس کے دل کی گہرائیوں کی آواز بھی یہی ہوتی ہے کہ کاش اللہ کا دین اس کی زمین پر کامل صورت میں نافذ ہو۔ مومن کی جدوجہد کا شاندار نتیجہ یہی ہے کہ اللہ کے بندوں پر صرف اللہ کا قانون ہی جاری ہو۔ صرف مالک کے سامنے ہی سر جھکایا جائے اور سارے طاغوتوں کو سرنگوں کر کے قلب و نظر کے کعبے میں سے ایک ایک بُتِ طنّاز کو رخصت کر دیا جائے اور بادشاہی اور حُکم سارے کا سارا صرف اللہ کا ہی ہو کر رہے۔ یہ وہ آخری اور کامل صورت ہے جس کے لیے دِل تڑپتا ہے، آنکھوں میں آنسو چھلکتے، سینے میں جذبے انگڑائیاں لیتے اور جذبات مشتعل ہو کر اس کی آمد کا انتظار کرتے ہیں۔

قرآنی تاریخ کی گواہی لیکن انبیاء کی قرآنی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ آخری اور کامل کامیابی انسانی تاریخ کی عظیم اسلامی تحریک، حضورِ اکرمؐ کی جماعت کو ہی حاصل ہوئی۔ اور یہ کامیابی بھی یہی گواہی دیتی ہے کہ داعیٔ حق بہر حال اپنے ساتھیوں کی رفاقت اور مدد سے ہی حالات کے سینے میں سے کوئی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے اِس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ داعی کے ساتھیوں اور تحریک کے کارکنوں کی تعداد، استعداد، صلاحیت، اخلاص، ایثار و قربانی، اور بنیادی انسانی صفات اور اسلامی دعوتی خصوصیات اس معرکے میں فیصلہ کُن ہوتی ہیں۔ نظامِ زندگی بدلنے کا یہ اجتماعی کھیل ایسا ہے جس کو ایک باصلاحیت ٹیم کے بغیر کوئی کپتان اکیلا نہیں کھیل سکتا کپتان تو ہدایات دے سکتا ہے۔ اعلیٰ منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ مخالف ٹیم کی پالیسی سمجھ کر اس کا توڑ کر سکتا ہے لیکن وہ اپنے ساتھیوں کی جگہ خود نہیں کھیل سکتا۔ خود تو وہ اپنی جگہ ہی کھیل سکتا ہے اور اپنا کردار ہی ادا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام دھوکے، چالبازی، شعبدہ بازی، اور دغا فریب کا بھی نہیں ہے کہ تنہا ایک فرد وقتی طور پر لوگوں کو نظر فریبی میں مبتلا کر کے ایک نتیجہ نکال کر دکھا دے۔ بلکہ یہ کام تو سیدھا سادھا انسانی اصلاح کے لیے عملی جدوجہد کا فطری کام ہے جو کسی گروہ کی اجتماعی جدوجہد کی تعداد اور جدوجہد کرنے والے افراد

کی استعداد کے مشترکہ سرمائے سے نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انسانی تاریخ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوش قسمت ترین داعئ حق ہیں کہ انہیں اپنے دور کا بہترین انسانی سرمایہ میسر آیا اور حضورؐ نے بھی اس سرمائے سے خوب خوب کام لیا۔ چُن چُن کر اپنی ضرورت کے آدمیوں کو لیا اور جو آگے بڑھ کر اس جدوجہد میں شریک ہوئے ان میں سے ایک ایک فرد انسانی معاشرے کا گلِ سرسبد تھا۔ تحریک کے لیے ایثار و قربانی میں کوئی کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اپنے ہی افرادِ خانہ، افرادِ خاندان، اور برادری اور قوم کے لوگوں سے لڑ جانا اور تلواریں سونت کر انسانی مقتل میں نکل آنا کوئی معمولی کھیل تماشہ نہیں ہے۔ اپنے آباد بھرے شہروں کو بیک وقت بہ حیثیت جماعت چھوڑ جانا اور ان میں سے کسی ایک فرد کا بھی قربانی سے پیچھے نہ رہنا کوئی معمولی ایثار نہیں ہے۔ اپنے معاشی مفادات اور چودھراہٹوں پر لات مار کر فقیر اور درویش بن کر نکل کھڑے ہونا کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ امتحانات ساری جماعت کے فرد فرد نے دیئے اور سارے ہی کارکن ان سارے ہی امتحانات میں کامیاب و کامران نکلے۔ جب ایسے ایثار پیشہ کارکن ہوں اور اتنی بڑی تعداد میں موجود ہوں تو پھر ان کو دوہری کامیابی سے کیوں نہ نوازا جاتا۔

تین مطلوب چیزیں: اخلاص۔ ایثار و قربانی اور استقامت

نظریہ کا مطالعہ کر لینا، اسے بیان کر لینا اور پھر اس کے لیے ولولہ انگیز پرجوش تقاریر کر لینا تو چشم و گوش و زبان کا کام ہے لیکن نظریے کے لیے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہونا اور زبانِ حال سے یہ کہہ دینا کہ "لو سنبھالو یہ مال و متاع، میرے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ ہی کافی ہیں" وہ عظیم عملی شہادتِ حق ہے جسے ادا کرنے کے لیے صدیقؓ و فاروقؓ کا جگر چاہیے۔ تحریکِ اسلامی کی دنیوی کامیابی کے لیے جس ٹیم کی ضرورت ہے اس کی صفات قرآن و حدیث میں بہت وضاحت سے بیان کر دی گئی ہیں اور خود حضور اکرمؐ کی تحریک کے کارکنوں نے اپنے عمل کی زبان سے اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ان صفات سے نظر چرا کر گزرنے والا کوئی شخص بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ قوم کے اندر اسلامی تحریک چلانے والوں کی متناسب (PROPORTIONATE) تعداد، ان لوگوں کا اپنے مقصد کے لیے اخلاص و جذبہ اور زبردست ایثار و قربانی۔ اور ہر آزمائش میں عزیمت و استقامت کا عملی مظاہرہ، یہ تین چیزیں فراہم ہو جائیں تو تحریک کی دوہری کامیابی کا امکان یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن ان عناصر میں جس درجہ کمی ہو گی خوشگوار نتائج کی دوری اور طوالت اسی قدر بڑھ جائے گی۔ اگر یہ چیزیں مطلوبہ معیار سے بہت کم ہوں تو عام مصلحِ اُمّت داعی تو الگ رہا خود نبی کی قیادت میں بھی نتیجہ اسلامی

نظام کے قیام کی صورت میں بر آمد نہیں ہوتا۔ ایثار و قربانی درحقیقت معاشی ضربیں کھانے اور تحریک کے راستے میں جان و مال کھپانے کا نام ہے۔ رشتہ و ناطہ اور الفت و محبّت کے تعلقات مقصدِ زندگی کے لیے اُستوار کرنے اور اسی کے لیے قطع کر دینے کا نام ہے۔ صرف اللہ کی رضا چاہنے اور دوسرے ہر شخص کی رضا کو اللہ کی رضا کے تابع کر دینے کا نام ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ بکا ہوُا سمجھنے اور فروخت شدہ غلام کی حیثیت سے ہی اس کے ساتھ معاملہ کرنے کا نام ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ: ۱۲) — اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن صرف ایک اللہ کی بندگی ہی کر سکتا ہے، وہ کسی دوسرے کی بندگی اور اطاعت خدا سے آزاد ہو کر نہیں کر سکتا، اور نہ وہ اُس صورت میں ہی چین سے بیٹھ سکتا ہے جب اس کے اپنے بادشاہ کا حکم اس پر جاری ہونے کے بجائے اس کے بادشاہ کے کسی باغی کا حکم اس پر جاری ہو رہا ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خوب فرمایا تھا کہ

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت (خواہشِ نفس) دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"۔

ظاہر ہے کہ اللہ کی بندگی کا معاہدہ اللہ کے ساتھ بیع کا معاملہ ہے اور بِک جانے کے بعد اس کی اپنی مرضی نہیں بلکہ خریدنے والے کی مرضی چلے گی۔ بلکہ یہ بھی وہ خود ہی طے کرے گا کہ بندے میں مصائب برداشت کرنے کی استعداد کس قدر ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا یہی مطلب ہے۔ وہ اپنے غلام پر وہ مصیبت ڈالے گا ہی نہیں جو اس کی وسعت سے باہر ہو اور جو مصیبت اس کی طرف سے آئے گی وہ اس ناپ تول اور فیصلے کے بعد ہی آئے گی کہ اس کی برداشت بندے کی وسعت میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے بندے تو اپنے مالک کے راستے میں گردنیں کٹاتے، پھانسیوں پر لٹکتے اور شہادت کے مراتب حاصل کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ وہ اپنے کس بندے کو پھانسی کے تختے تک لے جائے اور کس بندے کو معمولی قید و بند سے ہی واپس لے آئے۔ استعداد کے بارے میں یہ فیصلہ بندے کے حوالے نہیں کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ مالک خود کرتا ہے اگر یہ فیصلہ خود بندے کے حوالے ہوتا تو کتنے لوگ ہوتے جو درجاتِ عالیہ سے بہرہ ور ہوتے اور شہادت و صدیقیت کے مدارجِ عالیہ پر فائز ہو سکتے؟

مشالیں | دعوتِ دین کا راستہ ہی آزمائش و ابتلاء، ٹکراؤ اور دعوتِ مبارزت، تصادم اور جان دینے اور لینے اور سر ہتھیلی پر رکھ کر چلنے کا راستہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تحریک ابھی بالکل ابتدائی مرحلے پر ہی تھی جب وہ اپنے ساتھیوں سے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں:-

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین میں صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہونگے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے وہ اسے بچائے گا (انجیل متی ۱۰: ۳۴ - ۳۹)۔

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں --- آدمیوں سے خبردار رہو وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے، کوڑے ماریں گے اور میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کریں گے"

"اپنی صلیب آپ اٹھاؤ (یعنی سر ہتھیلی پر رکھ لو) اور میرے پیچھے آؤ۔ جو شخص میرے لیے اپنے ماں باپ بہن بھائی اور اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں"

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے"

اللہ کے راستے میں جان کے ساتھ ساتھ مال بھی کھپانے کے بارے میں فرمایا:

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو" (انجیل متی)

یہ تقریباً وہی بات ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی:

"اپنے وارث کے مال کو نہیں بلکہ اپنے مال کو پسند کرو اور تمہارا اپنا مال وہ ہے جو تم نے اللہ کی راہ میں آخرت کے لیے خرچ کر دیا"

ایک دوسرے موقع پر تحریک کے لیے مالی آزمائشوں کو برداشت کرنے کے لیے پیشگی تنبیہ کی۔

" حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اکرم کے پاس آیا :

" میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں" اس نے حضورؐ سے کہا :

آپ نے فرمایا " جو تم کہتے ہو اس پر غور کر لو "

" بخدا میں آپ سے محبت کرتا ہوں " اُس نے تین بار دُہرایا ۔

آپؐ نے فرمایا " اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر و فاقے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار فراہم کر لو ۔ جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی طرف فقر و فاقہ سیلاب سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتا ہے "

اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کے آغاز کے ساتھ ہی اسی نوعیت کے نقطۂ نظر کا اظہار حضرت عیسیٰؑ نے بھی کیا تھا جب انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا ۔

" کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا، تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے "

مزید فرمایا :۔

" اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے ۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں ، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے ۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے ۔ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے ۔ اے کم اعتقادو ، تم پہلے خدا کی بادشاہت اور اس کی راستبازی تلاش کرو تو پھر یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی " (انجیل متی) ۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک انقلابی دعوت کا پیغام ہے جس میں انسانی جان زبردست کھکھیڑ سے دوچار ہوتی ہے اور جن کو کھکھیڑ سے گریز ہو ان کا یہ راستہ نہیں ہے ۔ ایسے کٹھن راستے باتوں سے نہیں پیہم عمل اور مسلسل جدوجہد سے طے ہوتے ہیں ۔

قرآن کی تنبیہات | دنیا میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے جہاں زبردست جدوجہد، پیہم ایثار و قربانی تمام ضروری اسباب و وسائل کی فراہمی اور حالات کی سازگاری مطلوب ہے وہاں آخرت کے لیے بھی ایمان ، خلوص اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ راہِ حق میں قربانیوں کا قابلِ قدر ریکارڈ درکار ہے ۔ اسلامی نظام کی جدوجہد میں جو مقاماتِ آزمائش آتے ہیں اُن میں معاشی ذرائع کی بندش اور تباہی ، ملازمتوں کا چھوٹنا اور کاروبار کا مندا پڑنا تو اس راستے کے معمولی سنگِ میل ہیں جنہیں دیکھ کر ہی راستے کی شناخت ہوتی ہے ۔ ورنہ حقیقی راستہ تو مزید اس سے بھی

بہت آگے اور منزل تو اس کے بھی آخری سرے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے خالص بندوں کو آزمائشوں کے ذریعے ہی ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ زبانی دعووں میں تو منافقین بھی کسی سے کم نہیں کچھ آگے ہی ہوتے ہیں فرمایا گیا:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا یَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ ۔ (البقرہ - ۲۱۴)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی وہ حالات تو تم پر گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اُٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد، سنو! اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

مزید فرمایا گیا:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ۝ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِیۡنَ ۝ (العنکبوت - ۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یہ کہنے پر وہ چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا، حالانکہ ہم نے ان سب لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

اسی بیان کی تائید سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا یہ بیان کرتا ہے جب انہوں نے فرمایا "مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔"

"جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔"
(انجیل متی)

مالک کائنات جو وقتاً فوقتاً اپنی حکمت کے ماتحت انسانی آبادیوں میں اسلامی تحریک خود برپا کرتا ہے تاکہ اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے انتظام فرمائے۔ ایسی تحریک سے وابستہ ہونے والوں کو ہمیشہ جن جن آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ

ہم ضرور تم کو خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال و جان اور

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۔ (البقرہ: ۱۵۵) پیداوار کے نقصانوں کے ذریعے آزمائیں گے اور اے نبی ان لوگوں کو کامرانی کا مژدہ سنا دو جو ان خطرات و نقصانات کو صبر و ضبط سے برداشت کریں۔

اس آیت میں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو مندرجۂ ذیل آزمائشوں کے لیے نہ صرف تیار رہنے بلکہ ان میں سے صبر و استقامت کے ذریعے کامیابی کے ساتھ گزرنے پر ہی بشارت دی گئی ہے۔

— خوف و خطر

— فاقہ کشی اور شدید تنگ دستی

— مال و تجارت اور ملازمت کا نقصان اور دیگر معاشی پریشانیاں۔

— جان کا خطرہ اور اندیشہ

— ہر قسم کی پیداوار (زرعی صنعتی وغیرہ) کا نقصان

آزمائشوں کی اس اطلاع کے ساتھ اس دنیوی رشتہ و ناطہ پر بھی ضرب لگائی گئی ہے جو ایمان کے رشتہ میں پرویا ہوا نہ ہو۔

"تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُن لوگوں سے اُلفت و مودت کا رشتہ رکھے ہوئے نہ پاؤ گے جو اللہ اور رسولؐ کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں۔ خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہلِ خاندان کیوں نہ ہوں۔" (مجادلہ-۳)

اسی تنبیہ کے ساتھ ہم آواز ہو کر اس سے پہلے اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ بھی اپنے ساتھیوں سے کہہ چکے ہیں:

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سوگنا ملے گا اور وہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہو گا۔" (انجیل متی)

ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو کسی حاضر و موجود باطل نظام کے خلاف لڑ رہے ہوتے ہیں ان کا عمومی رویہ اس نظام کے ساتھ سخت غیر مصالحانہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ برسرِ جنگ ہی رہتے ہیں۔ البتہ کبھی یہ جنگ سرد ہوتی ہے اور کبھی گرم۔ یہ جنگ ایسی ہوتی ہے کہ اسلامی نظام کے علمبردار حصولِ انصاف کی خاطر بھی کبھی باطل نظام کی عدالتوں سے رجوع نہیں کرتے، اس لیے کہ طاغوت کا پورا وجود ظلم و زیادتی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے قانون کی حفاظت سے اپنے آپ کو محروم کرنا مومن کی حمیت کا بنیادی تقاضا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے

کسی انصاف کی توقع ہی عبث ہوتی ہے۔ مردِ مومن الٰہی قانون کے علاوہ کسی دوسرے اقتدار کو جائز اقتدار تسلیم نہیں کرتا۔ اس لیے اس کے لیے باطل کی عدالتوں سے حصولِ انصاف کی خاطر رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیمِ ملک سے پہلے انگریز کے اقتدار میں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں نے اپنے آپ کو عدالتوں کی طرف رجوع سے الگ کر لیا تھا اور طاغوتی قانون کی حفاظت میں جانے سے اپنے آپ کو خود محروم کر لیا تھا۔

غالب نظام کے مقابلے میں یہ طرزِ عمل خود آزمائشوں کو دعوت دینا ہے۔ نظامِ غالب اپنے باغی کو خود پہچان لیتا ہے اور پھر اس کے خلاف اس کے سارے حربے فرعونی جادوگروں کے سانپوں کی طرح حرکت میں آ جاتے ہیں اس لیے کہ کلمۂ حق بیان کرنا اور اعترافِ حق کر کے غلبۂ حق کے لیے جدوجہد کرنا اخلاص کی پہلی شرط ہے اور جیسے ہی دعوائے ایمان پیش ہوتا ہے زمانہ دلیلِ ایمان فوراً طلب کرتا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (آل عمران: ۱۷۹)

اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے کہ مومنوں کو اسی طرح رہنے دے جس طرح وہ اب ہیں۔ وہ باز نہ رہے گا جب تک طیب اور خبیث کو چھانٹ کر الگ الگ نہ کر دے۔

پھر سورۂ توبہ میں تو بالکل ہی صاف صاف للکار کر گروہِ مومنین کو بتا دیا گیا کہ دعوائے ایمان پھولوں کی سیج اور محض بیانِ سخنِ شیریں نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم مشن کی علم برداری کا اعلان ہے اور وہ مشن دنیا کی تمام حاکمیتوں کو مسمار و منہدم کر کے صرف اللہ کی فرماں روائی کا جھنڈا بلند کرنے کا مشن ہے۔ یہ دنیا کی تمام بڑی سے بڑی مادی طاقتوں کی گردن میں ہاتھ ڈالنے والی جسارت ہے۔ یہ بھڑوں کے چھتے میں نہیں بلکہ شیر کے بھٹ میں چھلانگ لگانے والی جرأت ہے۔ اس لیے اس تصادم میں مادی نقصانات کا ہونا اس کام کا فطری نتیجہ ہے چنانچہ ہر پسندیدہ چیز جو اللہ کی راہ میں قربان ہونی چاہیے گنوا گنوا کر بتا دی گئی ہے۔

قرآن فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

"ان سے کہہ دو کہ اگر تمہیں اپنے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندے پڑ جانے کا تمہیں ڈر لگا ہوا ہے اور وہ گھر بار جنہیں تم پسند کرتے ہو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو بیٹھے انتظار کرتے رہو

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ: ۲۴)

یہاں تک کہ خدا اپنا کام پورا کرے۔ یقین رکھو کہ اللہ فاسقوں کو کبھی ہدایت نہیں بخشتا۔

اور پھر اللہ نے جن لوگوں کو اپنے پسندیدہ اور فائز المرام بندے قرار دیا، ان کے کارناموں کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (التوبہ: ۲۰)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے ان کا درجہ اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا ہے اور وہی لوگ حقیقت میں کامیاب ہیں۔

ان آیات میں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو جو قربانیاں دینے کی دعوت دی گئی ہے وہ یہ ہیں:

۱- باپ، بیٹے، بھائی اور بیویاں جو محبت کے بہترین دنیوی رشتے ہیں،

— رشتہ اور برادری کے لوگ جو دنیوی بندھن میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔

— کمائے ہوئے مال جو دنیوی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔

— تجارت کا مندا پڑنا جو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا اور جس سے معاشی ترقی وابستہ ہوتی ہے۔

— گھر بار اور مکانات جو آرام و راحت کا مسکن ہوتے اور محنت و مشقت سے بناتے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ آبائی اور دیرینہ محبتیں وابستہ ہوتی ہیں۔

ان کی محبت میں گرفتار ہو کر اللہ کے دین کے لیے جہاد اور جد و جہد سے گریز کرنا فسق و فجور اور ہدایتِ الٰہی سے محرومی کا کام قرار دیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کو دھمکی دی گئی کہ وہ اللہ کا کام پورا ہونے تک انتظار کریں پھر وہ اپنا انجام بذاتِ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ (باقی)

ایمان اور طمانیتِ قلب[1]

(عبد الحمید صدیقی)

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (الانعام: ۸۲)

"اہلِ ایمان جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا انہی کے لیے حقیقی امن ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں۔"

امن کی یہ بشارت حیاتِ دنیا کے لیے بھی ہے اور موت کے بعد کی ابدی اور لازوال زندگی کے لیے بھی۔ جہاں تک اِس دنیا کا تعلق ہے مومن کو نہ تو امورِ رفتہ کی یاد ستاتی ہے نہ وہ پُر خطر حالات میں گھبراتا ہے اور نہ مستقبل کے اندیشہ ہائے موہوم اسے مضطرب کرتے ہیں۔ زمانہ کے تلخ و شیریں اور گرم و سرد حالات میں وہ کچھ اِس طرح پُرسکون رہتا ہے جیسے جنت میں پُرسکون زندگی بسر کرنے والا۔ یہ طمانیتِ قلب کی یہ متاعِ عزیز کتنی گراں قدر چیز ہے اس کا اندازہ صرف وہ پریشان آدمی کر سکتا ہے جو ہر وقت خوف اور اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ ایک دانا سے سوال کیا گیا سرور کیا ہے؟ اور خوشی کا راز کیا ہے؟ اس نے کہا "سکون"۔ کیونکہ محرومِ سکون کے پاس زندگی کے ہزار ساز و سامان بھی موجود ہوں تو اس کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔

محرومِ ایمان کا اضطراب اور صاحبِ ایمان کا سکون "مَیں ایک دائمی خوف میں مبتلا ہوں۔ لوگوں کا خوف، اپنی ذات کا خوف اور دیگر اشیاء و موجودات کا خوف۔ خوف مکمل طور پر میرا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ نہ دولت و ثروت مجھے سکون بخشتی ہے نہ بلند منصب، نہ صحت، نہ عورت، نہ محبت، نہ تفریح کے رنگا رنگ پروگرام۔ ہر چیز کو مَیں نے آزما دیکھا، کوئی بھی تو میرے لیے سکون بخش ثابت نہ ہوئی۔ آخر یہ خوف مجھ پر کیوں مسلط ہے۔ کیا یہ آلام و افکار کا پیدا کردہ ہے؟ نہیں مجھے کوئی غم لاحق نہیں، نہ کسی بات کی فکر ہے۔ دنیا اور اسبابِ دنیا میں سے ہر چیز میرے پاس موجود ہے

[1] یہ مضمون بھی الحیاۃ والایمان سے ماخوذ ہے۔

مال ہے، عزت ہے، تندرستی و توانائی ہے۔ حسن و جمال ہے پھر خوف کس بات کا ہے؟ کیا اللہ کا خوف ہے؟ نہیں ایسا بھی نہیں اللہ تو میری زندگی سے بالکل خارج ہے۔ پھر خوف کس کا؟ کیا معاشرہ کا؟ لیکن اِس کو تو میں سخت ناپسند کرتا ہوں۔ اِس سے بیزار ہوں اور اس کا مذاق اڑاتا رہتا ہوں۔ تو کیا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ مگر اس کی مجھے پروا نہیں۔ نہ اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے۔ کبھی کبھی میں اِس لیے بھی خوفزدہ رہتا ہوں کہ اب تو کوئی ایسی چیز نہیں جس کا خوف کھاؤں لیکن بعد میں نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اور کبھی اِس بات کا خوف ہوتا ہے کہ اس وقت ہر نعمت میسر ہے۔ پھر شاید رہے نہ رہے۔ ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود میں سکون سے محروم ہوں۔ سب کچھ پا لینے کے بعد بھی میں بے چین ہوں۔ معلوم حقیقتوں سے نہیں نامعلوم اور مجہول امور سے خائف رہتا ہوں۔ میری بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ میرے خوف و ہراس اور تشویش و اضطراب کی بنیاد خود زندگی ہے۔" یہ اُس شخص کی قلبی کیفیت جو ایمان سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی دیکھیے کہ صاحبِ ایمان کے روز و شب کیسے گزرتے ہیں۔

وہ عام حالات تو درکنار انتہائی خطرناک مواقع پر بھی پُرسکون رہتا ہے۔ رسولِ پاک اور حضرت ابوبکرؓ غارِ ثور میں تھے اور کفارِ قریش ان کے تعاقب میں چاروں جانب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ڈھونڈ نکالنے والوں کے لیے بڑے بڑے انعامات تجویز کیے جا چکے تھے۔ اِس عالم میں چند لوگ تلاش کرتے کرتے ٹھیک اُسی غار کے اُوپر پہنچ گئے جس میں سرورِ کونینؐ اور جنابِ صدیقؓ موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر یہ لوگ اپنے پاؤں کی جانب دیکھیں تو ہم انہیں نظر آ سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انتہائی پُرسکون انداز میں فرمایا ابوبکر لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔ گھبراؤ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے تو ان کی والدہ محترمہ کا خیال تھا کہ بس اب چند ہی لمحوں کے بعد بچہ فرعون کے بے رحم جلادوں کی چھری کے نیچے ہو گا مگر فوراً ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ جب بچے کی جان کو خطرہ ہو تو اسے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا جائے۔ والدہ نے ۔۔ جی ہاں اُس نومولود بچہ کی والدہ نے سب کام اپنے ہاتھ سے انجام دیئے۔ کمالِ سکون کے ساتھ اور اِس ایمان کی بدولت کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اگر ایمان نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو طمانیتِ قلب کی بہت بڑی مقدار فراہم نہ کی ہوتی تو وہ بیٹے کو موت کے مُنہ میں جھونکنے پر کبھی تیار نہ ہوتیں۔

ایمان ہی اصل سرچشمۂ امن ہے مومن صرف خدا سے ڈرتا ہے اور یہ ایک ڈر اُسے خوف و بے اطمینانی کے دوسرے تمام حملوں سے محفوظ و مامون کر لیتا ہے۔ اُسے اللہ کے سوا اُس پوری کائنات میں کوئی دوسری طاقت ایسی نظر نہیں

آتی جو اُس کی زندگی اور موت یا نفع ونقصان پر اثر انداز ہو سکتی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشرک معبودانِ باطل سے ڈراتے تھے مگر خلیل اللہ کا استدلال یہ تھا کہ تمہارے جھوٹے معبودوں سے میں کیوں ڈروں حالانکہ تم شرک کرتے ہوئے سچے خدا سے نہیں ڈرتے۔ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ۔ غور تو کرو فریقین میں سے کون امن کا زیادہ مستحق ہے۔ خدا کے پرستار یا شرک کے علمبردار۔ معلوم ہوا کہ ایمان اور توحید ہی میں امن وسکون کا راز مضمر ہے اور اس کے مقابلے میں کفر وشرک آدمی کے اندر خوف، گھبراہٹ اور بے اطمینانی پیدا کرتے ہیں۔ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۵۱) ہم کافروں کے دلوں میں (دوسروں کا) رعب ودبدبہ اور خوف ڈال دیتے ہیں۔ اِس لیے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک روا رکھتے ہیں"۔

منکرین اور متشککین کے اندیشے منکرینِ حق کو سب سے زیادہ اضطراب لاحق ہوتا ہے۔ زمانہ اور اس کے حوادثات سے، نیز فقر وفاقہ اور بیماری سے وہ ہر وقت لرزہ براندام رہتے ہیں۔ اور موت سے تو اُن کے خوف کا عالم کچھ نہ پوچھیے۔ گویا وہ کوئی خوفناک دشمن یا خونخوار درندہ ہے۔ اخلاقیات کے فلسفی ابنِ مسکویہ نے لکھا ہے: موت سے صرف وہ شخص خوف کھاتا ہے جو حقیقتِ موت کو نہیں سمجھتا۔ نہیں جانتا کہ اُس کی روح کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا بدن مٹی میں مل جائے گا تو اُس کی شخصیت فنا ہو جائے گی مگر یہ عالم باقی رہے گا یا اس خوف کی بنا وہ درد والم ہوتا ہے جو عالمِ نزع میں آدمی اٹھاتا ہے۔ یا بعد موت کسی سخت سزا وعقوبت کا تصور اُسے دہشت زدہ کرتا ہے۔ یا وہ اس لیے متاسف رہتا ہے کہ ڈھیروں مال جمع کر کے وہ خود خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ بہر حال اِسی قسم کے اوہام کے تحت اس کی زندگی گزرتی ہے جو ہر آن ایک قلق، ایک خوف اور ایک اضطراب سے دوچار رہتی ہے۔

مومن رزق کے معاملے میں مطمئن رہتا ہے دنیا میں انسان کو بالعموم جو چیزیں پریشان رکھتی ہیں ان میں سے ایک رزق کا معاملہ ہے۔ لوگ رزق کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے؟ حلال وحرام کی تمیز اٹھا دیتے ہیں۔ عزت وناموس کو داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ کسی ایک ذریعۂ روزگار پر انحصار کرنے کے بجائے متعدد ذرائع اختیار کرتے ہیں اور صرف اپنی ذات تک ہی نہیں بلکہ اپنی اولاد واصغار کے لیے پشتوں تک کا بندوبست کرتے ہیں۔ یوں ہر طرح رزق کا تحفظ کرنے کے باوجود انہیں سکون نصیب نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں اہلِ ایمان ہیں کہ جن کے لیے رزق کا مسئلہ کبھی دردِ سر نہیں بنتا۔ وہ اللہ کی صفتِ ربوبیت ورزاقیت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں یہ ارشادِ باری وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: ۶) فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیتا ہے جب وہ اِس

یقین دہانی کے عین مطابق پرندوں کو آشیانوں میں، درندوں کو جنگلوں میں، مچھلیوں کو سمندروں میں اور کیڑے مکوڑوں کو چٹانوں تک کے اندر رزق پہنچتے ہوتے دیکھتے ہیں تو اپنے قوی و قدیر خدا کے نظامِ رزق رسانی پر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اِس اطمینان کا نتیجہ ہے کہ جب ایک مومن کو فرض پکارتا ہے تو وہ شہادت کے ارمان سینے میں پالتے ہوتے میدانِ جہاد کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے درآنحالیکہ وہ اپنی اہلیہ چھوٹے چھوٹے بچوں اور ضعیف والدین کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ وہ اُنہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو صرف اِس یقین و ایمان کے سہارے کہ ان کا حقیقی سہارا خدا ہے جو اُس سے زیادہ مہربان ہے اور اُس سے بہتر ذرائع پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مومن موت سے بھی نہیں ڈرتا رزق کے بعد دوسری چیز جس کا لوگوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے موت ہے۔ مگر موت و حیات سے متعلق وہ واضح حقائق جو ایک مومن کے پیشِ نظر رہتے ہیں اگر عام لوگ بھی اُن کا اِدراک کر لیں تو شاید موت کی طرف سے وہ کچھ سکون محسوس کریں۔ مومن اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ زندگی کی مہلت اور موت کا ایک وقت معین ہے اس میں کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (الاعراف: ۳۴)۔ دوسری چیز جسے مومن اچھی طرح سمجھتا ہے یہ ہے کہ موت سے فرار بہر حال ممکن نہیں ہے۔ ہر ذی روح پر یہ گھڑی وارد ہو کر رہنی ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: ۱۸۵)۔ ایک اور بات جو موت کے خوف کو زائل کر کے رکھ دیتی ہے یہ ہے کہ اس مرحلہ سے گزر کر ہی وہ دارِ فانی سے دارالخلود کی طرف کوچ کر سکتا ہے، ابدی و سرمدی انعاماتِ خداوندی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور انبیاء و صلحاء کے حضور میں جگہ پا سکتا ہے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ موت کو ریب و تشکک میں مبتلا انسان ہی ناپسند کرتا ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو محبّ کو محبوب کے قریب کرنے والی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک نیک آدمی کا وقتِ موت قریب آ پہنچا تو وہ اٹھا غسل کیا خوشبو لگائی اور دو رکعت نماز ادا کرنے لگا۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد جب لوگ اس کے قریب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ قبلہ رُخ پڑا ہے اور اس کی رُوح پرواز کر چکی ہے۔ اس کے سر کے پاس ایک کاغذ پڑا ملا جس پر یہ اشعار درج تھے ؎

قل لاخوان رأونی میتنا — فبکونی و رثونی حزنا !!

اتظنونی بانی میتکم — لیس ھذا المیت واللہ انا

احمد اللہ الذی خلصنی — و بنیٰ لی فی المعالی مسکنا

لا تظنوا الموت موتا انه لیس الا نقلۃ من ھاھنا

(ترجمہ) میرے بھائیوں سے کہو جو مجھے مُردہ پا کر رنج و غم کی وجہ مجھ پہ روتے اور اظہارِ تاسف کرنے لگے ہیں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مَیں مر گیا ہوں، خدا کی قسم مَیں مرا تو نہیں۔ بلکہ مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے دنیا کے مصائب سے نجات دلائی اور میرے لیے بلندیوں میں ایک مسکن تعمیر کیا بھائیو موت کو موت نہ سمجھو، یہ تو یہاں سے عالمِ آخرت کی طرف محض منتقل ہونا ہے۔

موت کے بارے میں یہ خوشگوار تصور خاصانِ امت کے ہاں ہی نہیں ملتا بلکہ عام اہلِ امت بھی اِسی احساس سے سرشار پائے گئے ہیں۔ ایک بدّو کا مرض شدت اختیار کر گیا تو لوگ کہنے لگے اب تو آپ مر جائیں گے۔ اُس نے پوچھا موت کے بعد مَیں کہاں جاؤں گا؟ وہ بولے اللہ کے پاس۔ اس پر بدو نے کہا تو پھر خوف کس بات کا؟ اللہ ہی تو وہ ہستی ہے جو خیر و عافیت کا مصدر و منبع ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ سِرّ موت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خرابی و ویرانی کے بغیر آبادی نہیں ہوتی۔ نہ اچھی طرح کھدائی کیے بغیر قیمتی خزانہ ہاتھ لگتا ہے۔ اِسی طرح پھولوں کی ہستی فنا ہو تو پھلوں کو حیات ملتی ہے بعینہٖ روح کی تقویت اور بالیدگی اور اسے لباسِ جدید عطا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ جسدِ خاکی فنا کر دیا جائے اور یہ موت کے بغیر ممکن نہیں۔ مزید یہ اگر کسی نعمت کو سلب کرنے کے بعد اللہ کی صفتِ جود و سخا کا تقاضا یہ ہے کہ اُس سے بڑی نعمت عطا کرے۔ پس اگر وہ دنیائے فانی کی حیاتِ ناپائدار سلب کرتا ہے تو کچھ اِس لیے نہیں کہ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دے بلکہ اِس لیے کہ حضرتِ انسان کو اِس سے بہت بہتر حیاتِ جاوید عطا کرے۔

مومن کو جن ذرائع سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک کا نام امید ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو زندگی کی شبِ تاریک کو منور کرتی ہے اور زندگی کی خوفناک اور پُر پیچ گزرگاہوں میں انسان کو عمل کی صاف سیدھی شاہراہ دکھاتی ہے۔ شجرِ زندگی کو اس سے بالیدگی ملتی ہے۔ تمدن کا عظیم الشان قصر اپنی تعمیر کے لیے اس کا مرہونِ منّت ہے اور اسی کی بدولت سعادت و خوش بختی کا مزہ قائم رہتا ہے۔

امید انسان میں عمل کا داعیہ پیدا کرتی ہے، اور مداومتِ عمل پر اسے اُبھارتی رہتی ہے۔ کاہل کو چُست اور چُست کو اور زیادہ سرگرمِ عمل بنا دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ کسان کو جو چیز دن رات کھیت میں خون پسینہ ایک کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ اچھی فصل کی امید ہے۔ تاجر خطرناک سفر اختیار کرتا ہے تو نفع کی امید پر۔

طالب علم کبھی محنت نہ کرتا اگر اسے کامیابی کی امید نہ ہوتی۔ ایک سپاہی اگر شجاعت و جوانمردی کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا محرک فتح و ظفرمندی کی امید کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔ مریض کڑوی کسیلی دوائیں خوشی خوشی کھا لیتا ہے تو اس کی وجہ بھی صحت یاب ہونے کی امید ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بندۂ مومن اگر خواہشِ نفس کی مخالفت اور اپنے پروردگار کی ہر حالت میں اطاعت کرتا ہے تو اس عمل کے پیچھے بھی یہ امید ہی کارفرما ہوتی ہے کہ اسے اپنے پروردگار کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی، اور وہ اس کے انعاماتِ فراواں کا مستحق ٹھہرے گا۔ غرض یہ کہ ما اضیق العیش لولا فسحۃ الامل "زندگی کتنی تنگ ہوتی اگر عمل نے اس کا دائرہ کشادہ نہ کر دیا ہوتا"۔

اس کے مقابلے میں نا امیدی ہے جو سینے میں روشن شعلۂ امید کو بجھا دیتی ہے۔ اور حرکت و عمل کے تمام اسباب و دواعی کو یکسر ختم کر دیتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "ہلاکت کا باعث دو چیزیں ہیں نا امیدی اور تکبر۔ امام غزالیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو جمع اس لیے کیا گیا ہے کہ حصولِ سعادت سعی و طلب اور کوششِ مزید کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن مایوس آدمی نہ عمل کرتا ہے نہ مطالبہ اور مغرور و متکبر انسان تھوڑی سی کوشش کو بھی کافی سمجھ بیٹھتا ہے۔ نتیجۃً دونوں ناکام رہتے ہیں۔ اور یہ ناکامی وہ چیز ہے کہ جس کے ڈانڈے ہلاکت سے جا ملتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ زندگی اور سعادت سے ہمکنار زندگی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ پُرامید ہے۔

یاس اور کفر لازم و ملزوم ہیں | یاس کا عنصر سب سے زیادہ منکرینِ خدا اور کفار میں پایا جاتا ہے یا پھر ان لوگوں میں جن کا ایمان بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر صرف اپنے بل بوتے پر جیتا ہے اور اس کی نظر مادی وسائل پر ہی ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس عظیم کارخانۂ قدرت میں ایک انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟ اور اس کے اپنے وسائل کی حیثیت کیا؟ جن وسائل کو اس نے سب کچھ سمجھ رکھا ہوتا ہے وہ بہت جلد جواب دے جاتے ہیں تو ان کے بعد پھر مایوسی ہی مایوسی ہوتی ہے۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف: ۸۷)

پھر چونکہ کافر کا اپنے خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا، بنابریں اُسے مایوسی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی پس جو شخص جتنا زیادہ مایوس ہوگا اتنا ہی بڑا کافر ہوگا اور جس کا کفر انتہا درجہ کا ہوگا اس کی مایوسی بھی بلانہایت ہوگی۔

مایوسی کے لوازم میں کفر کے علاوہ شک بھی ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے وجود اور یوم حساب میں شک رکھتا ہے اُس کے حکیم اور عادل ہونے کا پورا یقین نہیں رکھتا۔ اُس کا دامن بھی اُمید سے تہی ہوتا ہے۔ اُسے نہ لوگوں سے خیر کی امید ہوتی ہے، نہ اس کائنات سے نہ خود زندگی سے۔ وہ سیاہ عینک کے ساتھ دنیا کو دیکھتا ہے۔ اس وجہ سے اُسے ہر چیز سیاہ اور شر و فساد سے مملو نظر آتی ہے۔ اُسے رُوئے زمین ایک جنگل اور اس میں

بسنے والے انسان وحشی اور درندے دکھائی دیتے ہیں۔ اِن مناظر میں اسے زندگی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر زندگی کے بارے میں قائم کر کے ابوالعلاء معری نے یہ شعر کہا ہوگا ؎

هٰذا جَنَاهُ اَبِی عَلَیَّ وَمَا جَنَیْتُ عَلٰی اَحَد

یہ میری زندگی ایک ایسا جرم ہے جو میرے باپ سے سرزد ہوا۔ لیکن مَیں نے ایسا جرم کسی پر نہیں کیا۔ یعنی مَیں کسی کی پیدائش کا سبب نہیں بنا۔

ایمان امید کو جنم دیتا ہے | جس طرح یاس اور کفر لازم و ملزوم ہیں اُسی طرح اُمید اور ایمان بھی متلازم ہیں۔ چنانچہ ایک ایماندار سب سے زیادہ پُرامید اور خوش گمان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان نام ہی اُس اعلیٰ اور عظیم طاقت کو تسلیم کرنے کا ہے جو اس کائنات کا انتظام کر رہی ہے۔ جس سے کوئی چیز مخفی نہیں اور جو کسی کام سے عاجز نہیں۔ ایسی ہستی، جو ہر مجبور و مضطر کی پکار سُنتی ہے، جواب دیتی ہے اور اس کی مصیبت کو دُور کرنے کی پُوری پُوری صلاحیت رکھتی ہے، کو ماننے والا نا امید کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ اللہ جو اپنے بندوں پر اُس سے کہیں زیادہ مہربان ہو جتنی کہ ماں بچے پر ہوتی ہے۔ وہ اللہ جو دن کے وقت جُرم کرنے والوں کو معاف کرنے کے لیے رات کو انہیں اس بات کے لیے پکارتا ہو کہ وہ آئیں اور اس کی بارگاہ میں عفو طلب کریں۔ وہ اللہ جو گنہگار کو آمادۂ توبہ و انابت دیکھ کر اُس سے زیادہ خوش ہوتا ہو جتنا صحرائے لق و دق میں اپنے سر و سامان اور سواری کو گم کرنے والا قریب المرگ مسافر، سواری کو اچانک سامنے پا کر خوش ہو سکتا ہے۔ وہ اللہ جو ایک نیکی کا بدلہ سات سو نیکیوں کے برابر دیتا ہو اور بدی کا بدلہ صرف ایک ہی بدی کے برابر دے یا بالکل ہی معاف کر دے۔ وہ اللہ جو اعراض کرنے والے کو قریب سے بلاتا ہو اور رجوع کرنے والے کی طرف دُور سے توجہ دیتا ہے — اُس اللہ پر ایمان کیا امید کو جنم نہ دے گا۔ خیر و عافیت کی امید کو، عفوِ تقصیر کی امید کو، حسن انجام کی امید کو اور ابدی و سرمدی سعادت کے حصول کی امید کو۔

مومن اور مادہ پرست کی امیدوں کا فرق | مومن کی امید و رجا کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی کیونکہ اُس کے ربِّ رحیم کے فضل و کرم اور رحمت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ مزید برآں اُس کی امید کوئی خام اور ناپختہ قسم کی امید نہیں ہوتی بلکہ نہایت مضبوط اور ناقابلِ شکست ہوتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے وہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ۔ وہ اللہ کے لیے جی رہا ہوتا ہے اور اللہ اُس کے لیے اپنی لامحدود طاقت وقف کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد امید ٹوٹنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟

مومن جب لڑتا ہے تو فتح کی مضبوط اُمید کے ساتھ لڑتا ہے وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے تو صحت کی پختہ امید کے ساتھ مرض کا مقابلہ کرتا ہے وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۔ اُس سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو امیدِ مغفرت کا دامن اُس کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۔ اُس پر تنگی اور مشکلات کا زمانہ آ جائے تو وہ کشائش اور فراخی کی امید رکھتا ہے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہوئے اللہ سے اجر کا امیدوار ہوتا ہے ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۔ وہ پیرِ فرتوت بھی ہو جائے تو اُسے اولاد کی امید رہتی ہے ۔ وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۔ اور وہ دنیا میں کفر و باطل کا غلبہ دیکھتا ہے تو کبھی یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا بلکہ استیلائے حق اور زوالِ باطل کی امید قائم رکھتا ہے اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔

مادہ پرست ظاہری اسباب پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے پیچھے کارفرما اللہ کی عظیم طاقت کو تسلیم نہیں کرتے مگر خدا پرست اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نظر صرف خدا پر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مادہ پرست جب نا امید ہو جاتے ہیں اور اُن پر دنیا باوجود فراخی کے تنگ ہو جاتی ہے تو خدا پرستوں پر دائرہ پھر بھی کشادہ ہی رہتا ہے ۔ مومن کی بیماری کو طبیب لاعلاج قرار دیتے ہیں تو وہ مایوس نہیں ہوتا بلکہ خدا سے اُمیدِ شفا قائم رکھتا ہے ۔ اُس کی پریشانی و محرومی اور اُس کی مظلومیت کا کوئی مداوا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہوتی وہ خدا کو ہر آن اِس قابل سمجھتا ہے کہ اُس پر ہونے والے ظلم کا ازالہ کر دے اور اُس کی پریشانی کو دُور فرما دے ۔ سیدنا ابراہیم اور حضرت زکریا علیہما السلام ظاہری اسباب کے لحاظ سے قطعاً اس قابل نہ تھے کہ اُن کو اولاد عطا ہو سکتی ، مگر دنیا نے دیکھا کہ وہ نعمتِ اولاد سے ہمکنار ہوئے ۔ حضرت یونس اور حضرت ایوب علیہما السلام پر ابتلا کی ایسی گھڑیاں آئیں کہ جن میں کوئی ان کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا مگر وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے ، اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی گوہرِ مقصود عطا کر دیا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر جا رہے تھے ، ساحلِ سمندر پر پہنچ کر دیکھا تو پیچھے فرعون کے لشکر تھے اور آگے سمندر کے تند و تیز تھپیڑے مگر حضرت موسیٰ کو اپنے رب کی قدرتِ کاملہ کا یقینِ محکم تھا اور بنی اسرائیل کی نجات کی پوری امید تھی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پایاب بنا کر حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو تو ظالموں کے تسلط سے آزادی بخشی ، دوسری طرف فرعون کو لشکر سمیت غرق کر دیا

تاریخ کے یہ وہ واقعات ہیں جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں مگر مادہ پرست ان میں سے بعض کا یا

سب ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا وقوع ان کے خیال میں معلوم اور معتاد اسباب کے ماتحت نہیں لیکن اہلِ ایمان تو سمجھتے ہیں کہ ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کو محدود نہیں کر سکتے۔ ان اسباب کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ اگر معتاد اسباب ہی اصل حقیقت ہوتے ہیں اور ان کے خلاف یا ان سے بالا کسی چیز کے بارے میں کچھ سوچنا اور پولنا غیر معقول ہے تو کیا اس طرزِ فکر کے ساتھ کسی قسم کی علمی ترقی ممکن ہے۔ کیا معتاد اسباب کے مقلد بن کر ہم ایٹمی اور خلائی دور میں داخل ہو سکتے تھے۔ اگر قدیم زمانہ کا تانگہ بان یہ کہتا کہ آمد و رفت کا ذریعہ تو بس یہ تانگے اور رتھیں وغیرہ ہی ہیں، ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سفر کرنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں، کیونکہ یہ معتاد اسباب کے خلاف بات ہے تو کیا تانگہ بان کی اس بات کو درست تسلیم کر لیا جاتا۔ اگر نہیں تو مادہ پرستوں کی خدا کے معاملے میں یہ جسارتیں کیسے درست ہو سکتی ہیں۔

امید زندگی کے لیے ناگزیر ہے | اگر امید کا وجود نہ ہوتا تو آج علمی ترقیات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ اہلِ علم و ایجاد اپنے زمانہ کے ثابت شدہ امور سے آگے صرف اس امید پر قدم بڑھاتے رہے کہ وہ نامعلوم حقائق کو دریافت کریں گے اور زندگی کی بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کر سکیں گے۔ چنانچہ جب انہوں نے دامنِ امید پکڑ کر جد و جہد کا آغاز کیا تو کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

داعیانِ حق، مصلحینِ امم اور تحریکوں کے بانی اگر اس امید سے سرشار نہ ہوتے کہ اُن کا مشن کامیاب رہے گا تو کیا وہ میدانِ عمل میں کودتے ؟ اور اگر بے دلی کے ساتھ کود بھی پڑتے تو کیا ان کی حیثیت ان سپاہیوں کی سی نہ ہوتی جو اسلحہ کے بغیر محاذِ جنگ پر پہنچ جائیں۔ ایسی سپاہ کا مقدر فتح و نصرت تو نہیں ہو سکتا۔

عام زندگی کے معمولات میں اگر امید ہم رکاب ہو تو مشکل کام آسان اور بعید چیز قریب ہو جاتی ہے لیکن مایوسیاں آدمی کو گھیر لیں تو آسان ترین کام بھی مشکل دکھائی دیتے ہیں۔ اور قریب الحصول مقاصد ناممکن نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ عظیم الشان تمدن، پرشکوہ ادارے آمد و رفت کے حیرت انگیز وسائل اور رواں دواں حیات کے جملہ مظاہر امید ہی کے تو متعدد کرشمے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہادیٔ برحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ آئیے ذرا اس امر کا جائزہ لیں کہ اس میں امید کس حد تک جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے آپ تیرہ سال تک مکہ میں دعوتِ اسلام دیتے رہے۔ طنز و طعن، تضحیک و استہزاء، شدید مخالفت ظلم و تشدد اور مقاطعہ تک نوبت پہنچی اور آپؐ اپنے پیروؤں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دینے پر مجبور ہو گئے، لیکن آپؐ نے حوصلہ

نہیں ہارا اور شعلۂ امید برابر آپ کے سینے میں روشن رہا۔ حضرت خباب بن الارت جن کا آقا لوہے کی سلاخیں گرم کرکے اُن کی پُشت کو داغ دیتا تھا رسولِ پاک کے پاس آتے ہیں اور بے پناہ مصائب اور ناقابلِ برداشت اذیتوں کی شکایت کرتے ہوئے آپ سے کافروں کے لیے بدُعا کی درخواست کرتے ہیں تاکہ ان کو قومِ عاد و ثمود کی طرح تباہ و برباد کر ڈالا جائے۔ مگر چہرۂ رسالتمآب اِس درخواست سے اُلٹا متغیر ہو جاتا ہے آپ حضرت خبابؓ کو صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہیں اور مستقبل کی کامیابی کی امید کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اے خبابؓ تم سے پہلے حق و صداقت کے علمبرداروں کو لوہے کے آروں سے دولخت کر دیا جاتا تھا مگر انہیں کوئی راہِ راست سے منحرف نہ کر سکا۔ خدا کی قسم یہ دین ضرور غالب ہو کر رہے گا اور ایک تنہا سفر کرنے والا صنعا سے حضرموت تک جائیگا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا مگر تم لوگ جلد بازی سے کام لیتے ہو" غور فرمائیے اس سنگین صورتِ حال پر استقامت کے پیچھے کیا شے کار فرما ہے اور ان ارشادات کے پسِ پردہ کیا چیز بول رہی ہے۔

پھر نبی آخر الزماں اور آپ کے تمام پیرو مدینہ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہجرت کے موقع پر آپ کا تعاقب کیا جاتا ہے اور آپ کے پیروؤں کو تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کسی کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔ مدینہ پہنچ کر بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیا جاتا۔ نت نئی جنگوں اور آئے دن کی جھڑپوں سے سابقہ پیش آتا ہے حتیٰ کہ ایک موقع پر پورا عرب مدینہ کی چھوٹی سی آبادی پر پل پڑتا ہے۔ مدینہ کے اندر یہود اور منافقین کی ریشہ دوانیاں اس پر مستزاد ہیں۔ اس موقع پر جب قرآن کے الفاظ میں خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے، کیا اللہ کی نصرت کی امید کے علاوہ کوئی اور چیز تھی جس نے مسلمانوں کو سہارا دیا۔

مختصر یہ کہ دنیا کے اس عظیم داعی حق صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت پرخطر اور مشکل زندگی میں جو چیز قدم قدم پر ولولۂ تازہ دیتی نظر آتی ہے۔ ہر آن حوصلہ بڑھاتی اور مزاحمت و مدافعت پر مسلمانوں کو ابھارتی ہے اور بالآخر نسبتاً کم وسائل رکھنے کے باوجود ابتداءً عرب کے وسیع و عریض علاقے پر اور بعد ازاں چار دانگِ عالم میں اُن کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتی ہے وہ امید ہے صرف امید۔ اللہ کے بے حد و حساب انعام و اجر کی امید، شہادت و فتح مندی کی امید اور تائید و نصرتِ الٰہی کی امید۔

مطبُوعات

A STUDY IN IQBAL'S PHILOSOPHY.
مطالعہ فلسفۂ اقبالؒ

تالیف جناب بشیر احمد ڈار۔ شائع کردہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز چوک انار کلی لاہور
صفحات ۳۲۹ ۔قیمت ۲۰ روپے۔

جناب بشیر احمد ڈار صاحب نے فلسفۂ اقبال کی تشریح و توضیح کے لیے گذشتہ تیس سالوں میں اتنا کام کیا ہے کہ انہیں فلسفۂ اقبال کا مستند شارح کہا جا سکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب فاضل مصنّف کی اقبال فہمی پر نہایت واضح شہادت پیش کرتی ہے۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ڈار صاحب نے آرٹ کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ علامہ کے نزدیک فن کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کو ارفع و اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے تیار کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے الفاظ میں "سب سے بہترین فن وہ ہے جو ہماری خفتہ قوتوں کو بیدار کرے اور ہمیں زندگی کے حقائق سے جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا درس دے۔ اس بنا پر تمام وہ چیزیں جو انسان پر حالتِ سکر طاری کردیں اور زندگی کے حقائق اوجھل کرنے کا ذریعہ بنیں وہ یقیناً انحطاط اور موت کا پیغام ہیں"۔ (ص ۲۰)

دوسرے باب میں اقبال کے ذہنی پیشروؤں یعنی نٹشے، برگساں، جیمز وارڈ کے افکار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے تیسرا باب اقبال کے فلسفۂ خودی پر مشتمل ہے جو بڑا فکر انگیز ہے اور جسے اس کتاب کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔ چوتھے باب میں اقبالؒ کے تصوّرِ معاشرت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس باب کے تحت بہت سے معاشی، سیاسی، معاشرتی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں مثلاً فرد اور سوسائٹی، مذہب کا جوہر، سماج کی پائیدار بنیادیں، توحید، نبوت، ختمِ نبوت، اسلام دشمن قوتیں، فکرِ یونان، تصوف، ملّا ازم، جہاد، حج، تصورِ حاکمیت، اسلامی ریاست، مارکسی اشتراکیت، انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل۔

شروع میں جناب ممتاز حسن صاحب کا بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل ہے۔

کتاب معیارِ طباعت عمدہ ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

بقیہ اشارات

اپنی قوم کے نونہال ہوں۔ ان بچوں نے آخر ملک و ملت کے خلاف کوئی سازش تو نہ کی تھی جس کی وجہ سے اُن پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے گئے۔ وہ صرف بنگلہ دیش کے معاملے میں اپنے احساسات سے حکومت کو آگاہ کرنا چاہتے تھے مگر حکومت نے ان کے احساسات سے آگاہ ہونے کے بجائے ان کی اس کوشش کو گستاخی بلکہ سرکشی پر محمول کیا اور برسرِ اقتدار طبقہ پوری قوت کے ساتھ ان معصوم بچوں کے مقابلے میں اس طرح خم ٹھونک کر میدان میں آگیا جس طرح کوئی سپاہ دشمن پر یلغار کرنے کے ارادے سے میدانِ جنگ میں اُترتی ہے۔ اس ملک کے حکمران طبقے کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کیا اس طرح کے حربے اختیار کرنے سے وہ جمہوریت کے علمبردار کہلانے کا مستحق ہوگا یا تاریخ میں وہ جمہوریت کے نام پر فسطائی نظام برپا کرنے والے کی حیثیت سے یاد رکھا جائیگا۔ اس امر کا جائزہ لیتے وقت صدر بھٹو صاحب کے ان وعدوں کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، جو انہوں نے اقتدار میں آنے سے پہلے ملک میں جمہوریت کو فروغ دینے کے سلسلے میں قوم سے کیے تھے۔

اندرونِ ملک سے نظریں ہٹا کر جب ہم بیرونِ ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بین الاقوامی سیاست میں بھی بھٹو صاحب کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیتے نظر نہیں آتے۔ جس سیمابی مزاج کا مظاہرہ وہ ملک کے اندر کرتے رہتے ہیں اس کا مظاہرہ وہ بین الاقوامی معاملات میں بھی کرتے ہیں۔ چند ماہ پیشتر بنگلہ دیش کے معاملے میں ان کے احساسات کا یہ عالم تھا کہ جو ملک اسے تسلیم کرتا تھا وہ فوراً اُس سے تعلقات منقطع کر لیتے تھے۔ اسی احساس کے تحت اُنہوں نے دولتِ مشترکہ کو بھی خیرباد کہا اور کئی ایک ممالک سے اپنے سفارتی تعلقات یک لخت توڑ دیئے مگر اب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا سودا ان کے ذہن میں اس بُری طرح سمایا ہوا ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کے طرزِ فکر میں اس نمایاں تبدیلی کی وجہ بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتی۔ بین الاقوامی سیاست میں کوئی ایسے دُوررس تغیرات تو رونما نہیں ہوتے ہیں جن کے پیشِ نظر پاکستان اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہو۔ پھر فکر و نگاہ کی اس عظیم تبدیلی کی وجہ بجز بھٹو صاحب کے ذاتی رجحان کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا دنیا کے کسی جمہوری ملک میں صدر کے ذاتی رجحانات کی اساس پر اس کی داخلی اور خارجی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں؟ خصوصاً ایسے صدر کے ذاتی رجحانات پر جس کی طبیعت سیماب آسا ہو اور جو اہم سے اہم مسائل کو عقل و دانش کی معتدل میزان

پر تول کر حل کرنے کے بجائے انہیں جذبات کی شعلہ فشانیاں کی مدد سے طے کرنے کا عادی ہو سطحی جذباتیت جمہوریت کا نہیں بلکہ فاشزم کا کارگر ہتھیار ہوتا ہے۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک صدر بھٹو کو حوان کے حسبِ منشا بلند و بالا مقام حاصل نہیں ہو سکا، اُس کی وجہ سے بھی ان کے تحت الشعور میں موہوم خطرات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اسے انسان کی یہ کوتاہ نظری سمجھیے یا حقائق کا سامنا کرنے سے فطری گریز کہ وہ انسانوں سے اُس قدر و منزلت کا تقاضا کرتا ہے۔ جس کا وہ خود اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے مگر انسان اوّل تو اسے عزت و توقیر کا اُس کی خواہش کے مقابلے میں کم تر مقام دیتے ہیں، یا اگر مصنوعی طریقے سے وہ اپنے مقام کو بلند تر بھی ثابت کر دے تو عوام اس کی ہمنوائی نہیں کرتے۔ عوام دل کی گہرائیوں میں اُسے وہی مقام دیتے ہیں جس کا وہ اپنے کارناموں کی وجہ سے مستحق ہوتا ہے۔ یہ تو تاریخ میں بارہا ہُوا ہے کہ نہایت اُونچے لوگ زمانے کے تغافل کی وجہ سے عوام کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے، مگر یہ کبھی نہیں ہُوا کہ کم حیثیت لوگ بعض نمائشی کاموں کی مدد سے تاریخ میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک بن گئے ہوں۔ یہ دنیا کا فی الحقیقت ایک تجربہ ہے کہ عوام کے قافلے اگر یہ ہر رہرو کے ساتھ تھوڑی دُور چلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس معاملے میں کوئی زیادہ تدبّر اور دانائی کا ثبوت نہیں دیتے مگر عوام کی عدالت ان قافلوں کی رہنمائی کرنے والوں کے بارے میں بڑے بے لاگ فیصلے کرتی ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جو جب تک تختِ اقتدار پر براجمان رہے اُن کے مصاحبین نے انہیں عمرِ ثانی کے القابات دیئے مگر تاریخ نے عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو عمرِ ثانی تسلیم نہیں کیا۔ جونہی اُن کے اقتدار کا دَور ختم ہُوا ان کا یہ اعزاز بھی ان سے چھن گیا اور تاریخ کی کسوٹی نے ہر سکّے کو اچھی طرح پرکھ کر اُسے اس مقام پر محفوظ کیا جس کا کہ وہ فی الحقیقت مستحق تھا۔ اسے تاریخ کے المیے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ شہرت اور ناموری کے حریص لوگ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور جس اونچے مقام کے وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے ہیں وہ جب انہیں ملتا نظر نہیں آتا تو وہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں پر غور کرنے کے بجائے اُسے دوسروں کی سازش خیال کرنے لگتے ہیں اور اُن پر دستِ ظلم دراز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ذہنی عارضہ ہے جو اگر کسی عام انسان میں بھی پایا جائے تو اُس سے اُس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی ذات سے اذیت پہنچتی ہے لیکن جب یہ عارضہ ملک کی سب سے بڑی اور با اثر شخصیت کو لاحق ہو تو اس کی تباہ کاریوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ تاریخ کے ایک بہت بڑے مفکّر سے کسی شخص نے

یہ سوال کیا کہ تم نے ساری عمر تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ میں صرف کی ہے تو آخر اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہا کہ میں نے تاریخ سے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق نہیں سیکھا اور یہی انسانیت کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔ خدا کرے کہ موجودہ حکمران اپنے پیش رووں کے عبرتناک انجام سے کوئی سبق حاصل کر سکیں۔ ماضی کے واقعات سے عبرت پکڑنا انسان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

ادارہ قارئینِ کرام اور ایجنٹ حضرات سے معذرت خواہ ہے جنہیں

تفہیم القرآن

جلد اوّل، جلد دوم اور جلد چہارم کی سپلائی میں دقّت پیش آرہی ہے۔

جلد اوّل اور جلد چہارم سٹاک میں موجود نہیں ہیں، ان کی طباعت کا کام شروع ہو چکا ہے۔

جلد دوم تکمیل کے آخری مراحل میں ہے عنقریب "ترجمان القرآن" میں اس کی تیاری کا اعلان کر دیا جائے گا۔

جلد سوم۔ جلد پنجم اور جلد ششم سٹاک میں موجود ہیں۔ انکے آرڈروں کی تعمیل کی جارہی ہے۔

نوٹ:۔ ایجنٹ حضرات اپنے بنک کا مکمل حوالہ دیا کریں

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور